سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی: اسلام پر سوال

ایڈیٹرز: پیٹرک حائینی ، سٹیفن لاثائن

RELIGIOSCOPE

سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی

اسلام پر سوال

ایڈیٹرز

پیٹرک حائنی ، سٹیفن لاثائن

تعارف

آلیور رائے

انگریزی ترجمہ

ٹام جنرِک

اردو ترجمہ وحواشی

جمشید اقبال

RELIGIOSCOPE

2012

فرانسیسی زبان میں Les Minarets de la Discorde کے نام سے Infolio Gollion نے 2009 میں شائع کی

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
1	تعارف: سوئٹزرلینڈ میناروں کے بغیر جین فرانسس میئر	1
5	میناروں کے سائے تلے عوامی اقدام کی وجوہات اور مضمرات جین فرانسس میئر	2
12	سوئٹزرلینڈ میں شہری اقدام سٹیفن لاثائن	3
14	مینار اور اسلامی تاریخ رائچڈ بابیزائن	4
18	سوئٹزرلینڈ میں اسلام: اعداد و شمار گرس اور ریلیجو سکوپ	5
20	ثقافتی چیلنج: مغرب میں اسلامی تعمیرات سٹیفن لاثائن	6
29	آسکر فریسنجر: ہمیں کثیر الاثقافتی نظریات کا شکار نہیں ہونا چاہیے پیٹرک حائینی	7
31	مغرب کو فتح نہیں کیا جاسکے گا پیٹرک حائینی، سمیر امغر	8
43	انتانیو ہوجرز: اسلام پر بنیاد پرستانہ تنقید بھی خطرناک ہے سٹیفن لاثائن	9
45	میناروں پر پابندی اور وفاقی آئین اقدام کی تاریخ، مقصد اور مواد اروین ٹائنر	10
53	ڈانیل زنگ: سوئٹزرلینڈ کی مسیحی بنیادوں کا دفاع جین فرانسس میئر	11

55	مسلمان ممالک میں کلیسا کی تعمیر لاؤر گور جیس	12
59	اینڈرڈیمیر ٹاس: اقدام سے آگے گہری کھائی ہے پیٹرک حائینی، سٹیفن لاثائن	13
61	میناروں سے مسلمانوں کے سوال تک اسلام پر تنقید کے نئے زاویے اولیور مُوس	14
68	مینار: مسلمان غصے کا اظہار نہیں کر رہے حسام طمام	15
72	ماحصل: میناروں کی چوٹی سے علامات اور سماجی نسیان اولیور موس، پیٹرک حائینی	16
75	حرف آخر: یورپ میں اسلام دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب آلیور روئے	17
81	کتاب کی تیاری میں حصہ لینے والوں کے مختصر کوائف	18

میناروں کے بغیر سوئٹزرلینڈ

جین فرانسس میئر

29 نومبر 2009 کے روز سوئس ووٹروں نے 57.5٪ کی واضح اکثریت سے سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی کے اقدام کی حمایت کی۔ رائے شماری کے ان غیر متوقع نتائج نے میڈیا اور سیاسی جماعتوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ گذشتہ رائے شماری کے نتائج یہ ثابت کر رہے تھے کہ میناروں پر پابندی عائد کرنے کی اس آئینی تجویز کو یکسر مسترد کر دیا جائے گا۔

ووٹنگ کے روز اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی؟ اس تجویز کے حامیوں کی تعداد میں درجہ بہ درجہ اس قدر اضافہ کیسے ہو گیا؟

زیرِ نظر کتاب ووٹ سے قبل نومبر 2009 میں فرانسیسی اور عربی زبان میں شائع کی گئی تھی۔ چونکہ میناروں پر ہونے والی بحث میں بین الاقوامی سطح پر دلچسپی پائی جاتی ہے، اس لئے اس کتاب کو، کچھ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ، کئی دیگر زبانوں میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ معمولی تبدیلی پیش لفظ کے اضافے کی صورت میں ہے جبکہ کتاب کے باقی مواد میں بہتری تو لائی گئی ہے لیکن اسے تبدیل نہیں کیا گیا کیونکہ ووٹ سے قبل سامنے آنے والے تجزیات اور معلومات کی اہمیت میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی۔ پیش لفظ کا مقصد ووٹ اور اس کے نتائج پر نظرِ ثانی کرنا ہے۔

29 نومبر 2009 کے روز یہ سب کیسے ہوا؟

میناروں پر پابندی کے شہری اقدام کے حامیوں کی ایک بہت بڑی تعداد مرکزی جمہوری یونین[1] سے وابستہ سیاست دانوں کی تھی۔ مرکزی جمہوری یونین ایک دائیں بازو کی سیاسی جماعت ہے جو اس وقت نائبین کی تعداد کی بنا پر ملک کی سب سے طاقتور جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی مخالفت کرنے والی دوسری بڑی جماعت وفاقی جمہوری یونین[2] اناجیلی طبقات پر مشتمل ایک چھوٹی قدامت پسند جماعت ہے۔ ان دو جماعتوں کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں، حکومت، پارلیمنٹ میں اکثریتی جماعت، رومن کیتھولک چرچ، اصلاح شدہ (پروٹسٹنٹ) نے، جو ملک کی اناجیلی مکتبِ فکر کی نمائندہ جماعت تصور کی جاتی ہے، سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ تاہم دانشوروں اور عوامی سطح پر مقبول شخصیات کی بہت کم تعداد کا خیال تھا کہ سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی عائد کر دی جائے۔

اس کے باوجود یہ اقدام واضح اکثریت کی حمایت کی بنا پر منظور کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ اس اقدام کی حمایت کرنے والے رجسٹرڈ ووٹرز کی تعداد 53.4٪ کی قابلِ احترام سطح تک پہنچ گئی۔ سوئٹزرلینڈ کے تناظر میں یہ تعداد اس لئے بھی بہت زیادہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ یہاں شہریوں کو سال میں کئی مرتبہ ووٹنگ کے عمل میں حصہ لینا پڑتا ہے۔

---

[1] Democratic Union of the Centre (SVP/UDC)
[2] Federal Democratic Union (EDU/UDF)

میناروں پر پابندی کی حمایت میں ڈالے گئے ووٹوں کی اتنی بڑی تعداد نے حکمران (سیاسی، ثقافتی، معاشی اور مذہبی) حلقوں اور اکثریت کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج واضح کر دی اور اس کا مطلب ہیت مقتدرہ کا واضح انکار تھا۔ ان نتائج کی روشنی میں گذشتہ رائے شماری کے نتائج کو بھی گمراہ کن خیال کیا جانے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا میناروں کی مخالفت کرنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے ارادوں کو منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتی تھی کیونکہ انہیں خوف لاحق تھا کہ کہیں انہیں سیاسی طور پر "غلط" قرار نہ دے دیا جائے۔

نتائج کے اعلان کے بعد لوگ کھلے عام اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے۔ جنوری 2010 میں ہانس ہرٹر اور ایڈریان ویٹر نامی دو محققین نے ووٹنگ کے نتائج کا تجزیہ ووکس سیریز آف ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ویب سائٹ [3] پر شائع کیا۔ اس تجزیے نے ووٹنگ کے موجودہ نتائج کی وجہ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے مابین خلیج کو قرار دیا۔

تجزیاتی رپورٹ کے مطابق 80٪ سے زائد دائیں بازو کے ووٹرز نے میناروں پر پابندی عائد کرنے کی تجویز کو رد کر دیا تھا۔ تاہم یہ سیاسی مراکز تھے جو تبدیلی کا باعث بنے۔ مرکزیت کے حامی ووٹرز نے میناروں پر پابندی لگانے کی تجویز کی "دو بمقابلہ ایک" کی نسبت سے حمایت کرکے اس کامیاب بنایا۔ توقعات کے عین مطابق، جہاں تعلیم کی شرح زیادہ تھی، وہاں پابندی کے اقدامات کی حمایت کی شرح کم تھی۔ اس تجزیے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ غیر گریزی (یہ ذہن میں رکھنا کہ سوئٹزرلینڈ میں رہنے والے 80٪ مسلمان بیرونی قومیت کے حامل ہیں) موجودہ نتائج کی وضاحت ہرگز نہیں کرتی۔ ایسے ووٹرز کی چالیس فیصد تعداد نے جو اپنے آپ کو باقی دنیا سے مربوط تصور کرتی ہے اور غیر ملکیوں کے ساتھ ہم آہنگی اور رابطے کی قائل ہے میناروں پر پابندی کے حق میں ووٹ دیا۔ نتائج کے تجزیے میں سامنے آنے والی حیران کن بات یہ تھی کہ بائیں بازو کی چند خواتین نے بھی پابندی کی حمایت کی۔ تاہم خواتین میں سے 16٪ نے پابندی کی حمایت کی اس طرح یہ تعداد مردوں کی نسبت نمایاں حد تک کم رہی۔

بالفاظِ دیگر نتائج سے قبل سامنے آنے والے دیگر تجزیات کے برعکس پابندی کی حمایت کرنے والی خواتین کی تعداد توقعات سے کم رہی۔

نتائج سامنے آنے کے بعد اس امر کی طرف بار بار اشارہ کیا جارہا تھا کہ لوگوں نے میناروں پر پابندی کی حمایت کرکے، اسلام سے منسوب اور مشروط توسیع پسندی کا انکار کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے ووٹ سے قبل شائع ہونے والے ایڈیشن میں شامل کئی مضامین میں لکھا گیا کہ یہ ووٹنگ محض میناروں کے مسئلے پر نہیں ہے بلکہ میناروں کو ان مسائل کی علامت سمجھا جارہا ہے جن کی وجہ اسلام ہے۔

اس پابندی کا نشانہ مینار اور مسلمان آبادکار نہیں بلکہ خود اسلام تھا۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایسے شہری علاقوں میں مجوزہ پابندی سے انکار کیا گیا جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تاہم دیہی اور نیم شہری علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اس پابندی کی پرزور حمایت سامنے آئی۔

---

[3] gfs.bern

آج مغرب میں اسلام بُری طرح تشخص (image) کے مسئلے کا شکار ہے۔ متذکرہ تجزیے کے مطابق 87٪ ووٹرز (جن میں پابندی کی حمایت اور انکار کرنے والے شامل) کا خیال تھا کہ "اسلام عورتوں پر تشدد اور ان کی ثانوی حیثیت کی حمایت کرتا ہے"۔

سوئٹزرلینڈ میں میناروں کے مسئلے کے سر اٹھاتے ہی یورپ میں مساجد کی تعمیر کا معاملہ متنازعہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ مساجد کی تعمیر کو عوامی مقامات پر اسلام کے قبضے سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔ عام طور پر اسلامی نشانات اور علامات کی موجودگی کا نتیجہ عوامی ردِ عمل کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس ردِ عمل کی شدت کا اندازہ بعض ممالک میں حجاب، برقعے اور سکارف کے موضوع پر ہونے والی بحث سے لگایا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ دیگر یورپی ممالک نے ووٹنگ کے نتائج کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان ممالک میں بھی یہ عمل دہرایا جائے تو اس کے نتائج کم و بیش ایسے ہی نکلیں گے۔

سوئٹزرلینڈ کے مسلمانوں نے نتائج پر معتدل ردِ عمل ظاہر کیا۔ نتائج سے قبل مہم کے دوران بھی انہوں نے محتاط ردِ عمل ظاہر کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا منفی ردِ عمل جلتی پر تیل کا کام کرے گا۔ تاہم ان میں سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں معتدل راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ووٹنگ کا نتیجہ کچھ بھی نکلا ہو، مسلمانوں کے روزمرہ معمولات اور مذہبی زندگیوں پر منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے۔

سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی کُل تعداد چار تھی اور ان میں سے کوئی بھی اذان کے مقصد کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ مسلمان میناروں کے بغیر نماز ادا کرنے کے سلسلے میں پوری طرح آزاد ہیں۔

مسلمان ممالک میں ووٹنگ کے ان نتائج پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ اس نوعیت کا ردِ عمل نہ صرف انفرادی طور پر حکومتوں کی سطح پر منظرِ عام پر آیا بلکہ اسلامی کانفرنس کی تنظیم نے بھی ان نتائج کی کھل کر مذمت کی۔ سوئٹزرلینڈ کو خبطِ اسلام [4] کا شکار ملک قرار دیا گیا۔ اسلامی ممالک اور تنظیموں کی طرف سے اس بات پر زور دیا گیا کہ ووٹنگ کے نتائج کو تسلیم نہ کیا جائے۔ تاہم یہ مطالبہ کرنے والے سوئس جمہوریت کی نوعیت اور انداز سے ہرگز واقف نہ تھے۔

دوسری طرف، اِکا دُکا معمولی واقعات کے علاوہ، ووٹنگ کے نتائج کے بعد سوئٹزرلینڈ کے خلاف کسی باقاعدہ مہم کا آغاز نہیں کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس مسئلے کی نوعیت، مثال کے طور پر، ڈینمارک میں بننے والے توہین آمیز خاکوں کی طرح انتہائی اشتعال انگیز ہرگز نہ تھی۔

[4] Islamophobic

سوئٹزر لینڈ کے سیاسی نظام نے وفاقی آئین میں ایک آرٹیکل کا اضافہ کیا ہے جو ملک میں تعمیراتی انتظام کاری پر اثر انداز ہو گا۔ تاہم سوئس ووٹ کسی بھی قسم کی بے قاعدگی کا آئینہ دار ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ مغرب میں ''مسلمانوں کے مسئلے'' کے سر اٹھانے کا ''سوئس اظہاریہ'' ہے۔ اس بنا پر معروف مورخ اُرس الٹرماٹ سوئٹزر لینڈ کو دورِ حاضر کا نقیب اور ووٹنگ کے عمل کو یورپی مباحث میں اہم قدم قرار دیتا ہے۔[5]

[5] *NZZ am Sonntag*, 6 December 2009

میناروں کے سائے تلے

عوامی اقدامات کی وجوہات اور مضمرات

جین فرانسس میئر

"بڑے شہروں کے شور شرابے کے درمیان میناروں سے سنائی دینے والی اذان کی آواز غیر یقینی ہوتی جارہی ہے"۔
یہ الفاظ ہیں بوسٹن کالج میں اسلامی فنون کے تاریخ دان پروفیسر جاناتھن بلوم کے جو دنیا بھر میں میناروں کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔
"لیکن مینار ہوتے رہیں گے۔ یہ دنیا بھر میں اسلام کی خاموش علامات کے طور پر باقی رہیں گے"۔

میناروں کی علامتی نوعیت سوئٹزرلینڈ کی سیاست بحث کا مرکز بن چکی ہے۔ لیکن بے چینی، اضطراب اور اہم سوال جو میناروں کے سوال کی اوٹ میں چھپ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، ان سب کو سمجھنے کے لئے ہمیں شہریوں کے اس اقدام کو سمجھنا ہو گا جس کی بنا پر میناروں کی تعمیر پر 29 نومبر 2009 کے روز ووٹنگ کے نتائج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں مینار نایاب تو نہیں کم یاب ضرور ہیں۔ 2005 میں جب میناروں کی موجودگی نے تنازعے کا روپ اختیار کیا تو اس وقت سوئٹزرلینڈ میں صرف دو مینار تھے۔ ان میں سے زیورک مینار کا افتتاح 1963 میں ہوا۔ اس مینار کی اونچائی اٹھارہ میٹر ہے اور یہ تحریک احمدیہ کی تعمیر کردہ چھوٹی سی مسجد پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ مسجد تحریکِ احمدیہ سے وابستہ ان مبلغین نے تعمیر کی تھی جو 1963 میں سوئٹزرلینڈ آئے تھے۔ (مسلمانوں کی اکثریت جماعتِ احمدیہ کی شدید مخالفت کرتی ہے۔ انہیں پاکستان "غیر مسلم" قرار دے چکا ہے۔ احمدیوں کے مکہ میں داخل ہونے پر بھی پابندی عائد ہے)

دوسرا مینار جینوا میں پیٹٹ سائیکونکس کے مقام پر موجود ہے۔ اس مینار کی اونچائی بائیس میٹر کے لگ بھگ ہے اور یہ مسجد اور ملحقہ اسلامک ریسرچ فاونڈیشن کی عمارت کے اوپر 1978 سے موجود ہے۔ اس مینار اور مسجد کا افتتاح اس وقت کے سوئس صدر کی موجودگی میں سعودی فرمانروا نے کیا تھا۔

اس مینار کے بعد تیس برس تک سوئٹزرلینڈ میں کوئی اور مینار تعمیر نہیں کیا گیا۔ تاہم اس عرصے کے دوران سوئٹزرلینڈ میں اسلام تیزی سے پھیلا ہے جس کی ایک اہم وجہ بالکان اور ترکی سے آنے والے لوگ ہیں۔ ان تین عشروں کے دوران مسلم دنیا سیاسی اور سماجی زلزلوں کی زد میں رہی ہے اور اسلام جہاد جیسے الفاظ کے متنازعہ تضمن کا حامی قرار پایا ہے۔

دنیا کے باقی ممالک کی طرح سوئس میڈیا نے بھی اسلام سے مشروط جہادی کلچر کو شہ سرخیوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جس وقت میناروں کا مسئلہ سامنے آیا، تو اس مسئلے کو اسلام کے جہادی پس منظر میں دیکھا گیا اور یہ مسئلہ اسی تناظر میں سوئٹزرلینڈ میں سیاسی بحث کا حصہ بنا۔ 10 جنوری 2005، ترکش ایسوسی ایشن نے وینجن (سولوتھرن چھاونی کے علاقے میں) ایک علامتی مینار تعمیر کرنے کے منصوبے کا آغاز کیا۔ اس مینار کی

اونچائی پانچ سے چھ فٹ ہونی تھی۔ اجازت نامے کے حصول کے مرحلے پر یہ بات منظرِ عام پر آئی تو اس منصوبے کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس منصوبے کے خلاف تعمیراتی کمیشن 400 دستخطوں پر مبنی ایک پٹیشن لایا اور اس طرح اس منصوبے کو مسترد کر دیا گیا۔

جولائی 2006 میں حکام نے اس شرط پر مینار کی تعمیر کی اجازت دے دی کہ اسے اذان کے مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ نومبر 2006 میں انتظامی حکم نامہ سامنے آیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مینار کی تعمیر سے عمارت کی نوعیت ہرگز تبدیل نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ عمارت پہلے ہی نماز اور دیگر مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے استعمال کی جا رہی تھی۔ اس دوران کئی درخواستیں دائر کی گئیں اور معاملہ متنازعہ صورتِ حال اختیار کر کے طول پکڑ گیا جب تک کہ وفاقی عدالت کے ایک فیصلے نے 4 جولائی 2007 کے روز تمام درخواستیں رد کرتے ہوئے مینار کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ اس مینار کا افتتاح جون 2009 میں ہوا۔

ونٹر تھر کے مقام اسلامی مرکز کی عمارت کے سر پر سجا ہوا مینار مئی 2005 میں تعمیر ہوا۔ اس مینار کی تعمیر سے متنازعہ صورتِ حال جنم نہ لے سکی تاہم اس وقت تک تنازعے کی آگ سلگنا شروع ہو چکی تھی۔ وینگن کے مسئلے نے ایک تحریک جنم دی۔ بعض سیاست دانوں اور مضطرب شہریوں نے میناروں کی تعمیر کو سوئٹزرلینڈ میں "بے لگام اسلام آئزیشن" کا نام دیا۔ ان خیالات اور خدشات کو اس وقت تقویت ملی جب چند ماہ کے اندر کئی نئے تعمیراتی منصوبوں کا اعلان کیا گیا۔ اسلامی تنظیموں نے مینار تعمیر کرنے کے کئی منصوبے منظوری کے لئے پیش کر دیے۔ ان منصوبوں میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ میناروں کو اذان کی بجائے علامتی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

موذن کی اذان سے ہونے والے شور کے علاوہ علامت کا تصور ہی لوگوں اور حکام کی پریشانی کا باعث تھا۔ لینگن تھال میں ایک درخواست پر 3500 افراد نے دستخط کئے اور اس نوعیت کی 76 درخواستیں تعمیراتی حکام کو بھیجی گئیں۔ لینگن تھال کا معاملہ اس لئے بھی دل چسپ ہے کیونکہ یہاں ایک سکھ گردوارہ پہلے سے موجود ہے۔ یہ گردوارہ 2006 میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس عمارت کو صنعتی عمارت میں اس لئے تبدیل نہیں کیا گیا کیونکہ سکھ آبادی اسے مذہبی رسومات کے لئے استعمال کرتی ہے۔ یہ ایک سفید رنگ کی مرمریں عمارت ہے جس کے اوپر سنہری رنگ کے تیر دکھائی دیتے ہیں۔

مذہبی مقاصد کے لئے بنائی جانے والی مسیحی عمارتوں کی بھی مختلف وجوہات کی بنا پر مخالفت کی جاتی رہی ہے۔ تاہم سکھوں، ہندوؤں اور بدھ عبادت گاہوں کی تعمیر پر لوگوں نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لئے میناروں کی تعمیر پر پابندی کو محض غیر گریزی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میناروں کی مخالفت کرنے والوں کے محرکات مختلف ہوسکتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام مخصوص نوعیت کی بے چینی کا باعث بن چکا ہے۔ میناروں کے موضوع پر بڑھتی ہوئی عداوت کی وجہ منتشر عوامی خیالات اور کچھ سیاسی جماعتوں کا ان عام جذبات سے فائدہ اٹھانا ہوسکتا ہے۔ دائیں بازو کی سیاسی جماعتیں، مثال کے طور پر مرکزی جمہوری یونین نے حتیٰ کہ علاقائی ضلع (canton)[6] میں جہاں کوئی مینار تعمیر نہیں ہو رہا تھا اسلام اور اس سے وابستہ خطرات کے موضوع کو پکڑ لیا ہے۔

---

[6]۔ ایک چھوٹا سا علاقائی ضلع۔ علاقائی ضلع (canton) سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی ایک ریاست تصور ہوتا ہے جبکہ فرانس میں انتظامی وحدت کی ذیلی قسم۔ اردو میں ہم اسے صوبہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم زیرِ نظر کتاب میں Canton کو علاقائی ضلع لکھنے کو ترجیح دی گئی ہے۔

ستمبر 2005 کے دوران اس جماعت نے پارلیمنٹ میں تجویز پیش کی کہ مساجد کی تعمیر کا پر اجازت ناموں کا حصول ضروری قرار دیا جائے۔ تاہم اس تجویز کی مخالفت میں 95 جبکہ حمایت میں صرف 5 ووٹ سامنے آئے اور اس طرح اس تجویز کو منظور نہ کیا گیا[7]۔ نومبر 2005 کے بعد، وینجن امور کے سامنے آنے کے بعد، سولوتھرن میں مرکزی جمہوری یونین نے علاقائی ضلع میں پارلیمنٹ کا فلور سنبھال لیا تا کہ "ناخوشگوار احساس جنم دینے والی" مذہبی عمارتوں کی تعمیر کا عمل روکا جاسکے۔ اس جماعت کا زور اس نکتے پر تھا کہ مذہبی نوعیت کی ہر نئی عمارت کی تعمیر سے قبل خصوصی اجازت نامے کا حصول ضروری قرار دیا جائے۔

اس پر حکومت نے یہ جواب دیا کہ "تعمیراتی قواعد وضوابط کی آڑ میں کسی مذہب کو پھیلنے سے روکنا امتیازی اور جانبدارانہ عمل ہونے کی وجہ سوئس آئین سے متصادم ہے"۔ [8]

ستمبر 2006 کے دوران متذکرہ بالا جماعت نے اتنے زیادہ ووٹ جمع کر لئے کہ حکومت کو پارلیمانی اقدام پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا جاسکے جس کا مقصد ایسی تعمیراتی منصوبہ بندی سامنے لانا تھا جس کی مدد سے علاقائی ضلع میں میناروں کی تعمیر کو روکا جاسکے۔ واضح رہے کہ اس کسی بھی مینار کی تعمیر کا منصوبہ زیرِ تکمیل نہیں تھا۔ اس دوران ایک نائب نے یہ تسلیم کیا کہ میناروں کی تعمیر پر پابندی لگانے سے مسائل ہرگز حل نہیں ہونگے۔ تاہم لوگ توقع کر رہے تھے کہ "حکومت اسلامی خطرے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقدامات اٹھائے"۔

اس سیاسی جماعت کے برعکس دیگر جماعتیں تعمیراتی قواعد وضوابط کو "نظریاتی رنگ دینے" کے خطرات سے آگاہ کر رہی تھیں [9]۔ میناروں کے مسئلے پر بڑھتی ہوئی تنقید کو دیکھتے ہوئے کچھ مسلمان حلقوں میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی تو دیگر مسلمان ساتھی سوئس شہریوں کو اپنے امن پسند ہونے کا یقین دلانے لگے۔

سوئٹزرلینڈ میں مسلمان خواتین کی ثقافتی تنظیم [10] کی صدر نادیہ کارموس نے اس موقع پر مقامی شہریوں سے اچھے تعلقات استوار کرنے پر مسلمان خواتین کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے نزدیک عصر حاضر کی ٹیکنالوجی (موبائل فونز، الارم اور برقی پیغامات) کی موجودگی میں نمازوں کے اوقات جاننے کے لئے میناروں کی ضرورت نہیں رہ جاتی [11]۔

بیسل کے کیتھولک بشپ کرٹ کوچ نے کہا کہ "اصولی طور پر یہ مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنی شناخت کے لئے مینار تعمیر کریں"۔ جہاں تک تعمیراتی قواعد وضوابط کا احترام کرنے کا تعلق ہے، کرٹ کوچ کے نزدیک مینار کلیسا کے مخروطے کی طرح کسی مسئلے کی بنیاد نہیں سمجھا جاسکتا [12]۔

---

[7] *Le Temps*, 15 September 2005
[8] *Neue Zürcher Zeitung*, 1 March 2006
[9] *Tages-Anzeiger*, 5 September 2006
[10] Association culturelle des femmes musulmanes de Suisse (Muslim Women’s Cultural Association of Switzerland)
[11] *Le Matin*, 8 September 2006
[12] *Neue Zürcher Zeitung am Sonntag*, 3 September 2006

تاہم میناروں کی مخالفت کرنے والوں نے مخروطے اور مینار کے مابین مماثلت ظاہر کرنے والی یہ مثال رد کر دی۔ ان کے نزدیک مینار فتح اور بالا دستی کی علامت تھی۔ ان کے نزدیک مینار ایک ایسا عمارت تھی جہاں ملک کے مذہبی اور سیاسی امن کو لاحق خطرات کی مسلسل گھنٹی بج رہی تھی۔ اس دوران ہر تعمیراتی منصوبے کے نتیجے میں سامنے آنے والا ردِ عمل اس خدشے کی تصدیق کر رہا تھا۔

ستمبر 2006 کے دوران میناروں کے مخالفین اس بات پر خوش نظر آتے تھے کہ کہ ان کی تحریک زور پکڑ چکی ہے۔ واضح رہے کہ میناروں کی مخالفت کرنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تعلق مختلف مکاتب فکر اور پس ہائے منظر سے تھا۔ یہ لوگ وینجن، لینجنتھال، وِل اور ونٹتھر میں مختلف متنازعہ معاملات میں بھرپور حصہ لیتے رہے تھے۔ یہ لوگ شہریوں کے اقدام کی حمایت کے لئے ایجر کنجن (سولوتھرم) میں جمع ہوئے۔ یہاں میناروں پر پابندی عائد کرنے کے لئے ایجر کنجن کمیٹی تشکیل پائی۔ اس کمیٹی نے پہلے پہل دیگر مسائل پر بھی غور کیا۔ تاہم مینار واضح طور پر دکھائی دینے والی علامات تھی۔ اس لئے اقدام مرتب کرنے والوں نے میناروں کو اسلامی وسعت پسندی کی علامت قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کے قانون (شریعہ) اور سوئس آئین کو باہم متصادم قرار دے کر توجہ حاصل کی۔

جولائی 2005 میں لندن میں ہونے والے بم دھاکوں سے ان خدشات کو مزید تقویت ملی۔ 2006 میں ڈنمارک میں بننے والے خاکوں کا معاملہ سامنے آیا جس نے غم وغصے کی آگ کو ہوا دی۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع نے ان معاملات پر کھل کر بات کی اور اس طرح اسلام کے موضوع پر ایک ناقدانہ مکالمے نے جنم لیا۔ ان واقعات کے علاوہ مقامی سطح چند دیگر واقعات بھی رونما ہونے لگے جن میں عورتوں کے سکارف، قبرستان میں مسلمانوں کے الگ مقامات کا وقف کرنا اور مسلمان لڑکیوں کو تیراکی کی تربیتی کلاسز سے خارج کرنے کے واقعات شامل تھے۔ ان واقعات نے یہ بات ثابت کر دی کہ کچھ غیر ملکی (مسلمان) سوئس معاشروں کے ساتھ باربط اور ہم آہنگ نہیں ہونا چاہتے۔ 2007 میں ایک ایسی تُرک خاتون کو سوئس قومیت دینے سے انکار کر دیا گیا جو یہاں 1981 سے رہ رہی تھی۔ چونکہ یہ خاتون سکارف پہنتی تھی، اس لئے یہ سمجھا گیا کہ اس خاتون نے سوئٹزرلینڈ میں رہتے ہوئے یہاں کی اقدار کو نہیں اپنایا جو اس کے قدامت پسند ہونے کی دلیل ہے۔ تاہم 2008 میں وفاقی کورٹ نے یہ فیصلہ درد کر دیا۔

تاہم ان تمام واقعات نے مل کر میناروں کے مسئلے کو تقویت دی۔ مئی 2007 میں شہری اقدام کا آغاز ہوا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر پہلی پریزنٹیشن کا اہتمام کیروز[13] ہوٹل کے فنکشن روم میں کیا گیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ علامات سے بچنا کس قدر مشکل ہے۔ اس موقع پر مرکزی جمہوری یونین[14] اور وفاقی جمہوری یونین [15] نے مل کر ایک کمیٹی، ایک چھوٹی اناجیلی جماعت، تشکیل دی۔ کمیٹی کے اغراض ومقاصد بیان کرنے والے بیانات کا اسلوب نہایت سادہ اور واضح ہے۔

---

[13]۔ سوئس زبان میں کیروز کا مطلب صلیب ہے جو کہ دینِ عیسوی (مسیحیت) کی علامت ہے۔

[14] Democratic Union of the Centre (SVP/UDC)

[15] Federal Democratic Union (EDU/UDF)

یہ کمیٹی وفاقی آئین کے آرٹیکل 72 میں ایک پیرے کا اضافہ چاہتی تھی کہ "میناروں کی تعمیر ممنوع ہے"۔ مرکزی جمہوری یونین کے قومی کونسلر الرِک شلر نے، جو اپنے آپ کو اسلام کا احترام کرنے والا سیاست دان کہتے ہیں، ایک بار پھر کہا کہ مینار مذہبی نوعیت کے حامل ہیں اور اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ سوئٹزر لینڈ کے مسلمانوں کو یک لخت میناروں کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے جب کہ وہ گذشتہ کئی برسوں سے عبادت خانوں میں نماز ادا کر رہے ہیں۔

وفاقی جمہوری یونین کے قومی کونسلر کرسٹین ویبر سے مزید کھل کر بات کی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ وہ اسلام کو دیگر مذاہب کی طرح مذہب کی بجائے مسیحیت اور دیگر مذاہب کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھتے ہیں[16]۔

اس کمیٹی نے اپنی تجاویز کے حق میں 18 ماہ کے عرصے میں 10,000 سے زائد شہریوں کے دستخط حاصل کرنے تھے۔ اسی دوران سوئس حکام کو، الجزیرہ ٹی وی پر نشر ہونے والی ایک رپورٹ کے بعد بین الاقوامی سطح پر شدید ردِ عمل کے خدشات لاحق ہوگئے۔ میڈرڈ میں اقوامِ متحدہ بین التہاذیب اتحاد[17] کے اجلاس کے دوران سوئس وزیرِ خارجہ میکالئن کالمیرائے نے اسلامک کانفرنس کی تنظیم[18] کے سیکرٹری جنرل کو وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا وہ سوئس شہریوں سے مناسب اور دانش مندانہ فیصلے کی توقع رکھتی ہیں[19]۔ اس کے باوجود دو ماہ بعد تنظیم کی شائع کردہ رپورٹ میں سوئٹزر لینڈ میں خبطِ اسلام کے فروغ کو بنیادی موضوع بنایا گیا۔

برن میں فیڈرل چانسلری کو 8 جولائی 2008 تک 115,000 دستخط پیش کر دیے گئے۔ مرکزی جمہوری یونین کے ایم پی، ڈومینک بائگ نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اقدام کو وسیع تناظر میں ہوئے کہا:

" آج کل اسلام سادہ، غریب اور حیات دوست لوگوں کو ایک مقوی اور جفاکش شناخت عطا کر رہا ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے اٹھائی جانے والی ذلت کی تلافی کرنے کے لئے دولت اور روزمرہ اصراف کی اشیا کمانے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ ہماری ثقافتی اقدار برداشت، تحمل، صنفی مساوات، باہمی احترام اور مکالمہ کی روایت بہت بڑی تعداد میں ہجرت کر کے آنے والوں کی وجہ سے غیر خطرات کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ جدت اور جدیدیت کے خلاف جنگ انتہا پسندوں کا بنیادی فلسفہ ہے۔ یہ لوگ جدیدیت سے اس لئے خائف ہیں کیونکہ جدیدیت پر مبنی اقدار انہیں اپنے تناظر میں کمزور دکھائی دیتی ہیں۔ تحمل اور برداشت کے اصولوں سے خالی اقدار کو پنپنے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ اور نہ ہی یہ سوال انتقام پر مبنی مخاصمت کا علم گاڑنے کی اجازت کا ہے۔ سوئس اقدار کے نام پر ہمیں پرہیز اور ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرنا ہے"۔

وفاقی حکومت نے میناروں پر پابندی کے اقدام کی بھرپور مخالفت شروع کر دی اور 27 اگست 2008 کو ایک طویل پیغام منظر عام پر لایا گیا۔ تاہم حکومت نے اس اقدام کو رد کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت کا خیال تھا کہ (میناروں پر پابندی کا اقدام) بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی

[16] *Neue Zürcher Zeitung*, 4 May 2007
[17] UN Alliance of Civilizations
[18] Organisation of the Islamic Conference (OIC)
[19] *La Liberté*, 16 January 2008

حمایت ضرور کرتا ہے تاہم اس پر عمل کرنا بین الاقوامی قوانین میں رخنہ اندوز ہونے کے مترادف نہیں کیونکہ یہ اقدام مسلمانوں کو مذہبی عقائد اختیار کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ہرگز نہیں روکتا۔
اس کے باوجود حکومت کے تجزیے کو کچھ حد تک سخت کہا جاسکتا ہے۔ حکومت کا موقف تھا کہ یہ اقدام غیر ضروری اور غیر مناسب پابندیوں کی حمایت کررہا ہے جن کا مطلب مذہبی آزادیوں دائرہ تنگ کرنے کے مترادف ہوگا۔ حکومت کے مطابق، اس اقدام نے سوئٹزرلینڈ میں اسلام کے فروغ کو روکنے اور ہمارے آئینی نظام کو شریعہ سے بدلنے کے عمل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مسجد پر مینار تعمیر ہونہ ہو، کوئی، اچھی یا بُری، کسی بھی نیت سے مسجد میں آجاسکتا ہے۔ حکومت نے یہ بھی موقف اختیار کیا کہ متذکرہ اقدام غیر منصفانہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے دیگر مذہبی اقلیتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے، صرف مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حکومت نے مزید زور دیا کہ یہ اقدام ملکی مفادات کے لئے نقصان کا باعث بنے گا اور مسلمان ممالک میں مسیحی آبادیوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

وفاقی حکومت نے، اس موقع پر، ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔ 1848 اور 1874 کے آئین میں کیتھولک مسیحی طبقات کے خلاف امتیازی شقیں[20] شامل تھیں۔ تاہم انہیں شقوں کو امتیازی قرار دیتے ہوئے 1973 میں آئین سے خارج کردیا گیا تھا۔ تاہم بشپ (تعلّقہ)[21] کی تعمیر پر پابندی 2001 میں ختم ہوئی تھی۔ اس وقت تک یہ پابندی وفاقی آئین کی دفعہ 72 پیراگراف 3 میں موجود رہی تھی۔ میناروں پر پابندی کی حمایت کرنے والا اقدام آئین کے اسی پیراگراف میں اضافے کا تقاضا کررہا تھا۔

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی اکثریت نے اس اقدام کو آئینی لحاظ سے جائز قرار دیا لیکن سفارشات پیش کیں کہ شہری یہ اقدام رد کردیں۔ کونسل آف سٹیٹ میں اسے 3 کے مقابلے میں 36 اور نیشنل کونسل میں 50 کے مقابلے میں 129 ووٹ ملے۔ اس موضوع پر بحث صحافتی مضامین، کانفرنس، ویب سائٹس، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے جاری رہی۔ ابتدأ میں کسی نے بھی اس مسئلے پر اوریجنل بات نہ کی۔ دونوں اطراف سے سامنے آنے والے دلائل کولہو کے بیل کی طرح چند قضیات کے گرد گھومتے رہے۔

اقدام کی مخالفت کرنے والوں کا خیال تھا کہ میناروں کی تعمیر پر پابندی عائد کرنا ایک امتیازی اقدام ہوگا کیونکہ میناروں پر پابندی عائد کرنا مذہبی آزادی پر حملہ کرنے کے مترادف ہے اور اس اقدام کی وجہ سے مسلم طبقات سوئس معاشرے سے ہم آہنگ نہیں ہوپائیں گے۔

دوسری طرف پابندی کی حمایت کرنے والوں کا خیال تھا وہ اسلامی فتوحات کی علامت کا انکار کررہے ہیں اور یہ اقدام مستقبل میں ہر ممکنہ تنازعے سے بچاؤ کا واحد راستہ ہے۔ یہ اقدام مسلمانوں کو سوئس معاشروں کے اصول اور طریقہ ہائے کار کو اپنانے میں مدد دے گا۔ ایک غیر جانبدار مشاہدہ کار کے لئے کسی ایک گروپ کے حق میں فیصلہ سنانا اس لئے مشکل ہو رہا تھا کہ کسی ایک مذہبی علامت پر پابندی (مثال کے طور پر فرانسیسی

---

[20]۔ واضح رہے کہ اس دور کے آئین کے مطابق جیسویٹ مسیحیوں کو ملک بدر کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور حکومت کی اجازت کے بغیر bishopricsاور covenents کا قیام کو ممنوع تھا۔

[21] Bishopric

سکولوں میں حجاب کا استعمال ممنوع قرار دیے جانے) کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر پگڑی پہننے والے سکھ بھی اسی نوعیت کے اقدام کی زد میں آسکتے ہیں۔

بحث کے دوران یہ بات قابلِ غور تھی کہ بحث کا محور میناروں کی نسبت اسلام اور اس کے ظاہری پہلو تھے۔ بہت سے حساس مسائل میناروں کے سایے میں طائرانہ نظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔

اس دوران مرکزی جمہوری یونین نے ، مسلم ممالک میں مسیحی عبادت گاہوں اور مقدس مقامات کے تناظر میں، متبادل حق [22] کے اصول پر زور دیا۔ جماعت نے موقف اختیار کیا کہ مسلمان سوئٹزر لینڈ کی مسیحی تاریخ اور ثقافت کا احترام کریں اور اعتدال پسند مسلمانوں کے برعکس انتہا پسند مسلمان ریاستی آئین کو شریعہ سے بدلنے کی کوشش نہ کریں[23]۔

ایسو پبلک انسٹی ٹیوٹ[24] نے نمونہ جاتی رائے شماری کا اہتمام کیا جس میں نمونے کے طور پر ایک ہزار لوگوں کی رائے لی گئی۔ رائے شماری کے دوران اقدام کی حمایت کرنے والوں کی جانب سے دل چسپ حقائق سامنے آئے۔

رائے شماری میں حصہ لینے والے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مینار طاقت کی علامت ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ مینار شور پیدا کرتے ہیں کیونکہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ انہیں موذن کی اذان نشر کرنے کے لئے استعمال میں لایا جائے گا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ مینار سوئس سرزمین اور ثقافت کا حصہ نہیں ہیں، اسلام دیگر تمام مذاہب کو باطل قرار دینے والا اور ان کے ساتھ امتیاز برتنے کا درس دینے والا مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک (خصوصاً سعودی عرب) میں دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اسلام ایک توسیع پسند مذہب ہے اور مسلمان کو چاہیے کہ سوئس معاشروں سے آہنگ ہو کر رہنا سیکھیں۔

سوئٹزر لینڈ میں اس وقت مذہبی عمارتوں پر اور مباحث بھی جاری ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک ایسوسی ایشن جو سوئٹزر لینڈ کے اس حصے میں کام کر رہی ہے جہاں جرمن زبان بولی جاتی ہے، کلیسا کی گھنٹیوں سے ہونے والے شور کے خلاف لوگوں کو جمع کر رہی ہے۔ ایسوسی ایشن سے منسلک لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اذان سے ہونے والے شور پر بھی کام کریں گے۔ تاہم میناروں کی بحث ٹریفک اور عبادتی نوعیت کے شور سے مختلف ہے۔ میناروں پر ہونے والی بحث ایک مرحلہ اور سوئٹزر لینڈ کے لئے اہم تاریخی موڑ ہے۔ میناروں پر ہونے والی بحث مغرب میں اسلام اور اس کے مقام پر ہونے والی بحث کا اہم حصہ ہے۔ اس بحث میں اس وقت شدت آجائے گی جب شہریوں کا اقدام کامیاب ہو جائے گا اور اس کا اثر صرف سوئٹزر لینڈ پر نہیں پڑے گا۔ اس بحث نے شہریوں اور سیاست دانوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی اختیار کیں۔ اس لئے سوئٹزر لینڈ میں میناروں کے سلسلے میں ہونے والی بحث ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ اس کی اہمیت کسی حکایتی نکتے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

---

[22] Reciprocity
[23] *Impulsion*, official UDF mouthpiece, May 2009
[24] Isopublic Institute

سوئٹزرلینڈ میں شہری اقدام

سٹیفن لاٹائن

سوئس جمہوریت کی روح شہریوں کو اقدامات کا حق دینا ہے۔ اس کے ذریعے شہری ملکی سیاست میں شامل ہوتے ہیں اور ووٹ کے ذریعے آئین پر نظر ثانی کی تجویز بھی پیش کرسکتے ہیں۔ اس تجویز کے ذریعے آئین کی کسی شق کا خاتمہ یا ترمیم ہو سکتی ہے۔ شہریوں کو یہ بنیادی حق ضلعی اور وفاقی دونوں سطحوں پر حاصل ہے۔ ضلعی سطح پر شہری اقدام قانون سازی کے لئے ڈرافٹ کی صورت میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ کیسے کام کرتا ہے؟

شہری اقدام کی کمیٹی، جو مثال کے طور پر کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہو سکتی ہے، فیڈرل چانسلری کو اپنی تجاویز(proposal) پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کمیٹی نے 18 ماہ کے اندر 10,000 لوگوں کے دستخط حاصل کرنا ہوتے ہیں۔ اگر مقررہ میعاد کے اندر اندر مقررہ تعداد میں دستخط حاصل ہو جائیں تو حکومت اس اقدام پر غوروخوض کرنے کے بعد اس کے قابلِ قبول ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اگر تجاویز سے کسی بین الاقوامی معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو ایسی تجاویز کو فوری طور پر رد کر دیا جاتا ہے۔

اگر کسی اقدام یا تجویز کو قابلِ قبول مان لیا جائے، تو وفاقی کونسل معینہ مدت کے اندر اس پر ووٹنگ کرانے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ تاہم، اسی دوران پارلیمنٹ ان تجاویز کی اختلافی تجاویز مرتب کر سکتی ہے۔ ان اختلافی تجاویز عام طور پر اقدامات کے ذریعے پیش کردہ تجاویز کو نئے سرے سے تحریک دیتی ہیں لیکن اس اسے تجاویز کا دائرہ کار محدود ہو جاتا ہے۔

منظور ہونے کے لئے ایک اقدام کو ''دوگنا اکثریت'' حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک اقدام کو قبول ہونے کے لئے محض ووٹس کی اکثریت نہیں بلکہ ضلعی اکثریت بھی درکار ہوتی ہے[25]۔

مقصد

شہری اقدامات کی مدد سے غیر مرکزی نوعیت کے سیاسی گروہ (چھوٹی سیاسی جماعتیں، پریشر گروپس وغیرہ روایتی نمائندہ باڈیز کے برعکس) اپنے مطالبات مرکزی سیاسی میدان میں پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تاہم شہری اقدامات کے منظور ہونے کی شرح اور امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1891 سے لیکر آج تک 160 میں سے صرف 15 اقدامات منظور ہو پائے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ شہری اقدامات غیر موثر سمجھے جاتے ہیں۔

---

[25]- مثال کے طور پر سوئٹزرلینڈ کے 26 کانٹونز میں سے اگر 14 وفاقی اضلاع کسی اقدام کی حمایت کریں تو اسے اکثریت تصور کیا جائے گا۔

اقدامات قبول ہوں یا نہ ہوں، یہ بلاواسطہ طور مختلف انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں:

- شہری اقدامات سیاسی فکر اور بحث میں تحریک پیدا کرتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں ان کا مقصد بعض سیاسی مطالبات پر زور دینے کی بجائے سیاسی نظام کی توجہ چند اہم سوالات کی طرف مبذول کرانا ہوتی ہے۔
- ان اقدامات کی مدد سے سیاسی نظام مخصوص سوالات سے آشنا ہوتا ہے اور اس طرح ایسے مسائل فیصلہ سازوں کے سامنے آتے ہیں جن کی اہمیت سے وہ پہلے آگاہ نہیں ہوتے۔

نتیجتاً اگر کوئی شہری اقدامات نامنظور بھی ہو جائے تو اقدام کی صورت میں تجویز پیش کرنے والوں کو شکست خوردہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اقدام کے اثرات کا اندازہ اس کی کامیابی یا ناکامی سے نہیں بلکہ اس صلاحیت سے لگایا جاتا ہے جس کی مدد سے وہ عوام کی توجہ حاصل کرتے ہوئے سیاسی میدان میں درجۂ قبولیت حاصل کرتا ہے۔ ایک اقدام جس قدر ووٹ حاصل کرپاتا ہے، تجویز کردہ معاملہ اسی اعتبار سے سیاسی مطالبات کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

اس لئے سوئٹزلینڈ میں شہری اقدام کے کردار کو اس کے نتائج کی بجائے وسیع اثرات سے پرکھا جاسکتا ہے۔ میناروں کی تعمیر کی مخالفت کرنے والوں میں سے ایک شخص کا کہنا تھا:

"بحث کا آغاز کرنے اور مکالمے کے عمل کو مہمیز کرنے کے لئے میں نے اقدام کے ان حصوں پر بھی دستخط کئے ہیں جن پر میں متفق نہیں تھا"۔

مینار اور اسلامی تاریخ

رائچڈ بینزائن

یورپ میں اسلام یا مسلمانوں کی موجودگی کو ہمیشہ ایک مسئلہ تصور کیا گیا ہے۔ مذہبی اور تاریخی کتب ایسے مواد سے بھری پڑی ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کے نزاعی تشخص کو تقویت ملتی ہے۔ میناروں کا مطلب کیا ہے؟ اگر ہم اس سوال پر غور کریں تو بہت کچھ کھل کر سامنے آسکتا ہے۔

میناروں کے بارے میں جاننے کے لئے ہمیں مساجد کی تعمیراتی ساخت کو تاریخی تناظر میں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ہوگا کہ یہ تاریخ پس منظر آج کے سوالات سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔

جس طرح کیتھیڈرل کا مسیحیت کے سرچشموں سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح میناروں کا اسلام کے ماخذ سے کوئی رشتہ نہیں۔ تاہم مسلمانوں کی یہ تعمیراتی علامت 8 صدی عیسوی میں مسلمانوں کی تعمیراتی تاریخ کا حصہ بنی۔ یہ وہ دور تھا جب مینار مسلم دنیا میں مساجد کا مستقل جزو بن گئے اور ان مقامات تک پہنچے جہاں انہیں پہلے پہل اجنبی سمجھا گیا۔

مینار کسی بھی قسم اور شکل کا ہو سکتا ہے: چھوٹا، لمبا، پتلا، دبلا، چوکور، گول، ہشت ضلعی (مثمّنی)، مخروطی، مرغولے دار، اینٹوں یا پتھر سے تراشا ہوا۔ مینار کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ موذن کی آواز دُور تک سنائی دے سکے۔ اس کے علاوہ اونچے مینار دنیا کے کسی بھی حصے میں اسلام کی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ 13ویں صدی کے بعد میناروں کو اسلامی فتوحات کی جلی علامت سمجھا جانے لگا تھا۔

سلطنتِ عثمانیہ نے ایسے مینار تعمیر کرانے میں انفرادیت کا ثبوت دیا جو نہ صرف بلند قامت تھے بلکہ ان کا رُخ آسمان کی جانب تھا۔ سلطان احمد اوّل نے 17ویں صدی کے دوران استنبول میں نیلی مسجد تعمیر کروائی اور دُور دراز سے آنے والے سیاح اس کے چھ طویل القامت میناروں کو دیکھ کر وجد میں آنے لگے۔ یہ مینار انسان کے خدا کی جانب ارتقائی سفر کی عکاسی کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ مینار ایک شہادت کی انگلی کی عکاسی کرتے تھے جو اللہ کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ اللہ جو یکتا اور لاثانی ہے۔ اس طرح مینار توحید کے بنیادی اسلامی عقیدے کا ایک مجازی روپ تھے۔ اس لئے یہ سمجھنا نہایت آسان ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک مینار کی کیا اہمیت ہے۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عمارت کو مسجد کا درجہ حاصل ہو لیکن اس پر کوئی مینار نہ ہو۔

ہم اسلامی تاریخ کے اوّلین میناروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایک عرب روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا تعمیراتی نمونہ، جسے مینار کہا جاسکتا ہے، 665 عیسوی میں شام کے شہر بصریٰ میں تعمیر ہوا۔ یہ شہر 634 عیسوی میں عرب گھڑ سواروں نے فتح کیا جن کا تعلق اس دور کی نومولود اسلامی سلطنت سے تھا۔ دیگر روایات کے مطابق پہلا مینار دمشق کی عظیم مسجد میں اموی خلیفہ ولید اوّل نے 1705 میں تعمیر کروایا۔ تاہم مصدقہ

روایت یہی ہے کہ میناروں کا اوّلین نمونہ بصریٰ میں 705 عیسوی میں تعمیر ہونے والی ایک مسجد ہے جو دمشق سے 145 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو اس مقام سے ایک سنگِ سیاہ کی تختی ملی ہے جس پر یہ تحریر لکھی ہے۔

"شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے: خدا کے غلام اور مومنین کے شہزادے یزید نے اس مسجد کی تعمیر کا حکم دیا اور مینار تعمیر کروایا۔ 102 میں تعمیراتی کام کی نگرانی الحارث نے کی" [26]۔

بالفاظِ دیگر، 724 عیسوی میں اموی خلیفہ یزید ثانی مسجد سے منسلک ایک ایسا ٹاور تعمیر کرنا چاہتا ہے جس کی لمبائی مسجد کی اصل عمارت سے زیادہ ہو۔ دوسرا مینار، جو اتنا ہی پرانا ہے، روایات کے مطابق القیروان (موجودہ تیونس) میں تعمیر 724 سے 727 ہجری کے درمیان تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مینار کی تعمیر کا حکم خلیفہ ہاشم ابن عبدالمالک نے دیا تھا۔ تاہم آثارِ قدیمہ کے موجودہ ماہرین کا خیال ہے کہ مینار اور مسجد کی تعمیر 9ویں صدی میں خلیفہ زیادۃ اللہ کے حکم سے ہوئی تھی۔ تعمیر کی تاریخ سے قطع نظر، اس میں کوئی شک نہیں اس مسجد پر تعمیر ہونے والا مینار شمالی افریقہ میں تعمیر ہونے والا یہ مینار اوّلین میناروں میں سے ہے۔

میناروں کی ساخت سے ان کے اُموی رشتوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان اُموی خلفا نے مکہ کی بجائے اسلام کا سیاسی دارالخلافہ دمشق کو بنایا اور مسلم دنیا پر 661 سے 750 عیسوی تک حکومت کرنے کے بعد عباسی خلافت کے تحت منتشر ہوئے۔ کچھ یہی صورتحال شام کے کلیساؤں کی ہے۔ شام کے کئی کلیساؤں پر مینار دکھائی دیتے ہیں۔ کیا یہ تعمیراتی اثر کا نتیجہ ہے؟

دمشق مسیحی دنیا کا ایک عظیم شہر تصور کیا جاتا ہے۔ عام لوگوں اور اشرافیہ نے وفاداریاں بدل کر نئے آقاؤں کو تسلیم کر لیا لیکن ان نئے حکمرانوں پر، ان گنت میدانوں میں، گہرے اثرات مرتب کئے۔ جو، عام طور پر، اُموی تہذیب کہی جاتی ہے دراصل جزیرہ نمائے عرب کے گھڑ سواروں اور شامی دنیا کے تصادم اور اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے۔

میناروں کی تعمیر کا کیا مقصد تھا؟ کیا ان کا مقصد اسلامی فتوحات کو ثابت کرنا تھا؟ کیا انہیں عبادت کے مقام کی نشان دہی کے لئے تعمیر کیا جاتا تھا تا کہ یہ دور سے دکھائی دے سکیں؟ مینار آنکھ کی رہنمائی کرتے تھے کہ یہ اوپر کو (خدا کی طرف) اٹھ سکے؟ پانچ اوقات اذان دینے کے لئے استعمال ہوتے تھے؟ یا پھر دشمن کی نگرانی کرنے کے لئے عسکری مقاصد کے استعمال میں لائے جاتے تھے؟

میناروں سے یہ سب کام لئے جاتے تھے۔ شام میں تعمیر کئے گئے کلیساؤں کے مینار دریوزہ گر مسیحی مبلغین اور راہبوں کے تبلیغی مقامات کے طور پر بنائے گئے تھے اور یہ کھلی فضا میں منبر کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ان میناروں کی مدد سے لوگوں کو عبادت کے لئے بلایا جاتا تھا۔ تاہم ان میناروں کی لمبائی 18 میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مینار کسی بھی شہر میں دینِ عیسوی کی موجودگی کی علامت بن گئے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کلیساؤں کے ساتھ تعمیر ہونے والے مساجد کے مینار بھی ان مقاصد کے علاوہ اسلام کی فتح کی نشانی کے طور پر تعمیر کئے جاتے ہوں۔

---

[26] Quoted by Jean Sauvaget, "*Les inscriptions arabes de la mosquée de Bosra*", *Syria*, 1941

بارہویں صدی عیسوی کے بعد تعمیر ہونے والے کلیساؤں کے میناروں میں عبادات کے بلاوے کے لئے گھنٹیاں بجائی جاتی تھیں۔ یہ مینار یورپ کے ان حصوں میں مسیحیت کی فتح کے علَم کے طور استعمال ہوتے تھے۔

عربی زبان کے دو الفاظ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں مینار (minaret) کے مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ پہلی اصطلاح "ماذانیٰ"[27] ہے جو بصریٰ میں 724 سن عیسوی میں ملنے والے سنگِ سیاہ پر کندہ دکھائی دیتی ہے۔ اس اصطلاح اور اذان کا مادہ ایک ہونے کی وجہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مینار کا بنیادی مقصد اس کا اذان کے لئے استعمال ہے۔ ماذانیٰ وہ مقام ہے جہاں موذن نماز کے اوقات کے مطابق لوگوں کو عبادت کے لئے بلاتا ہے۔

دوسری اصطلاح "مَ نَ رَ"[28] (ما۔ نا۔ را) ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب نگرانی کا ایسا ٹاور جہاں پر آگ جلا کر (یا آگ کے بغیر) نگرانی کی جائے۔ اسلامی تاریخ کی دوسری صدی کے دوران فطری یا شعوری لسانی و اصطلاحی تبدیلی کی بنا پر ماذانیٰ کو منارا کہا جانے لگا۔ یہ تبدیلی واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ دوسری صدی تک اذان دینے کے لئے استعمال ہونے والے میناروں سے نگرانی اور اسلام کی موجودگی کا احساس دلانے والے مقام کا کام لیا جانے لگا تھا۔

انگریزی اور فرانسیسی زبان میں استعمال ہونے والا لفظ minaret عربی زبان کے لفظ منارا سے مشتق ہے جو ترکی زبان میں پہلی بار 17 ویں صدی میں مینار لکھا (اور پڑھا) گیا۔ ماذانیٰ اور منارا آج بھی آگ کی بھٹی یا آتش دان (فانار) کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح ماذانیٰ، منارا اور فانار کا اشتقاقی رشتہ سکندریہ میں روشنی کے مشہور مینار فاروس سے جڑتا ہے جو دنیا کے سات عجائب میں سے ایک ہے۔ روشنی کا یہ مینار گذشتہ 17 صدیوں سے ملاحوں کی رہنمائی کر رہا ہے: تین صدیاں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل اور 13 صدیاں ان کی پیدائش کے بعد۔

بعض ماہرین تعمیرات نے روشنی کے ٹاورز کے لطیف ڈھانچوں میں مماثلت دریافت کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا فرش، چوکور، ہشت پہلو اور گول ہونے کی وجہ سے دوسرے سے جلتا ہے۔ روشنی کے ان ٹاورز سے ملتے جلتے مینار شام کے شہر حلب[29] اس کے بعد قاہرہ میں 14 ویں صدی عیسوی میں دکھائی دیتے ہیں۔ قاہرہ میں دسویں صدی عیسوی میں تعمیر ہونے والی مسجد الحکیم، جس کی بنیاد اہرام frustum سے ملتی جلتی ہے سکندریہ کے روشنی کے مینار سے متاثر ہو کر تعمیر کی گئی تھی۔

اسلام جس خطے میں بھی داخل ہوا مختلف شہروں کے چوک میں تین قسم کے مینار تعمیر ہوئے: چوکور مینار، گول ٹاور کی شکل میں اور ہشت گونہ ٹاور کی شکل کے مینار۔ چوکور مینار ان میں سب سے قدیم ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز شام میں ہوا یہ مینار مشرقی بحر ابیض کے راستے سے یورپ میں اس وقت متعارف ہوا جب اُموی خلافت نے سپین میں قدم جمائے۔

---

[27] *ma'dhana*

[28] عربی زبان کے لفظ "نار" (آگ) کے مادے سے مشتق۔

[29] Aleppo

چوکور مینار کئی منزلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر منزل پر ایک کمرہ اور کمرے میں چاروں طرف کئی ہوادار کھڑکیاں نصب ہوتی ہے۔12ویں صدی کے دوران مراکش میں تعمیر ہونے والی مسجد الکتبیة متذکرہ بالا میناروں کی ایک اہم مثال پیش کرتی ہے۔ گول ٹاور کی صورت میں یہ مینار 11ویں صدی میں ترکی سے تعلق رکھنے والے سلجوک فاتحین نے تعمیر کروائے تھے۔ اس قسم کے مینار ایران اور ترکستان میں دکھائی دیتے تھے۔ بعد ازاں اس نوعیت کے مینار انڈیا اور اناطولیہ میں بھی تعمیر کئے گئے تھے جو اس سے قبل استنبول کی نیلی مسجد پر دکھائی دیتے تھے۔ ان میناروں کی مثالوں میں مکہ کی عظیم مسجد کے نو مینار بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔ ان میناروں لمبائی 89 میٹر ہے۔

کثیر گونہ ٹاور کی شکل کے مینار گول ٹاور کی متبادل شکل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مینار غزنی (ایران)، ثمرقند اور قاہرہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان میناروں میں سب سے زیادہ مشہور دہلی کی مسجد کا قطب مینار ہے۔ گول اور کثیر گونہ ٹاورز پر مبنی میناروں کو بعض اوقات بالکونی اور نوک دار چوٹی کی تعمیر کی مدد سے وسعت دی جاتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ سوئٹزر لینڈ میں تعمیر ہونے والے میناروں کی شکل کیا ہوگی۔ تاہم اس مقام پر ہم ایک سوال کرسکتے ہیں۔

اگر اس بات کا ثبوت بھی مل جائے کہ مینار اسلام کے اوائل سے اسلامی طرزِ تعمیر کا حصہ ہے، کیا اس ثبوت کی بنا پر سوئٹزر لینڈ کے غیر مسلم شہریوں کو میناروں کی تعمیر کی اجازت دے دیں گے؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی عمارات انہیں للکار رہی ہیں یا پھر ان کے لئے اضطراب کا باعث بن رہی ہیں، کیا وہ یہ جان کر مطمئن ہوجائیں گے کہ میناروں کو تاریخی لحاظ سے صحت مند مذہبی سند حاصل ہے؟

مسئلے کو اس طرح حل کرکے ہم دو غلطیوں کے مرتکب ہورہے ہونگے۔

- اس طرح ہم کچھ کتب اور تحریروں کو معیار مقرر کردیں گے
- اور مذہبی روایات کے انسانی پہلوؤں کو نظر انداز کردیں گے۔

مذہبی روایات مکمل طور پر کتب یا تحریروں کے تابع نہیں ہوتیں کیونکہ یہ روایات، بہت حد تک، سماجی اور تاریخی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس لئے سوال ان عمارتوں کے کسی مذہبی نکتہ نظر سے جائز یا قانونی ہونے کا نہیں ہے۔ اس کے برعکس سوال غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی موجودگی کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان آبادی، کسی بھی غیر مسلم ملک میں، میزبان ملک کے ساتھ جڑت اور ہم آہنگی پیدا کرے گی یا پھر کچھ ادغانی اصولوں پر ڈٹ کر میزبان ممالک کی جدید روایات کو اپنانے سے یکسر انکار کردے گی؟

لازم ہے کہ غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمان مقامی ثقافت سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں اور مہمان ممالک کے ثقافتی ورثے کو اپنائیں۔ مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ جسے وہ کل تک "غیر ملکی" اور "اجنبی" سمجھتے تھے آج وہ "ملکی" اور "شناساں" ہیں۔ یہ سب بعض اوقات معاندانہ شکل اختیار کرسکتا ہے لیکن ہم آہنگی کے مطلوبہ عمل نے دنیا بھر کی ثقافت، تاریخی، تعمیرات اور خال وخد کو متاثر کیا ہے۔

سوئٹزر لینڈ میں اسلام: اعداد و شمار

گرِس اور ریلیجو سکوپ

سوئٹزر لینڈ میں اسلام کے موضوع پر کی جانے والی کسی بھی گفتگو میں سوئٹزر لینڈ میں اسلامی معاشرے کے فروغ اور اسلام کی مذہبی تنظیم کاری میں تفریق کرنا لازمی ہے۔ کسی بھی ملک میں مسلم آبادی کا سوال اہم ہے کیونکہ دنیا کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

1970 تک سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی آبادی نہایت کم تھی۔ عرب دنیا میں سیاسی انتشار اور جبر کے پیش نظر 1950 سے 1960 کچھ عرب سوئٹزر لینڈ میں آن بسے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے سوئٹزر لینڈ میں مذہبی تنظیم سازی کا آغاز کیا۔ واضح رہے کہ تنظیم سازی کرنے والوں میں مختلف ممالک سے آنے امیگرنٹس اور مزدور طبقات ہر گز شامل نہیں تھے۔

1970 کی دہائی میں ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ تاہم اس وقت تک ان کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی بہت حد تک مستحکم ہو چکی ہے۔ 1970 کی مردم شماری کے مطابق سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی تعداد 16,300 تھی جبکہ 1980 کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد 56,000 ، 1990 کی مردی شماری کے مطابق 152,000 اور 2000 میں ہونے والی مردم شماری کی مطابق سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی تعداد 310,000 ہو چکی تھی۔ حالیہ اندازے کے مطابق 2010 تک سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی تعداد 400,000 کے برابر ہے۔

سوئٹزر لینڈ میں مسلم آبادی کے اضافے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ 1970 میں خاندانوں کو جوڑنے کی پالیسی سامنے لائی گئی جس کی وجہ سے خاص موسموں میں آنے والے مہاجرین پر مشتمل آبادی کے استحکام اور صنفی توازن پیدا کرنے میں مدد ملی۔ صنفی توازن کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1990 کی مردم شماری کے مطابق 169,000 مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد 141,000 تھی۔ اس دوران بالکانی مہاجرین کی آمد کی وجہ سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی آبادی میں مزید اضافہ ہوا۔

اگر سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی تعداد کو قومیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس وقت یہاں سب سے زیادہ تعداد یوگوسلاویہ سے آنے والے مسلمانوں کی ہے جو کل مسلم آبادی کا ٪ 56.4 ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ٪21 تُرک اور ٪ 12 سوئس مسلمان ہیں۔ سوئس مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے ہیں جو یہاں شہریت حاصل کر چکے ہیں اور کچھ لوگوں ایسے ہیں جو مذہب بدل کر مسلمان ہو چکے ہیں۔ سوئٹزر لینڈ میں صرف ٪6 مسلمانوں کا تعلق مشرقِ وسطیٰ یا شمالی افریقہ سے ہے۔

مسلمان طبقات کے اضافے سے مذہبی انتظام کاری اور منصوبہ بندی کے مسائل کی وضاحت ہوتی ہے۔ پہلے پہل 1990 میں حجاب، قبرستانوں میں مسلمانوں کے لئے مخصوص مقامات، مسلمانوں لڑکیوں کو تیراکی کی کلاسز سے مستثنیٰ قرار دیے جانے جیسے مسائل منظرِ عام پر آئے۔ اگرچہ اس دوران اِکادُکا دیگر مسائل بھی سامنے آئے لیکن متذکرہ بالا مسائل ایک عشرے کے اندر ہنگامی بنیادوں پر حل کا تقاضا کرنے لگے۔ طویل مذاکرات

کے بعد، مسلمانوں کے لئے قبرستانوں میں مقامات مختص کئے گئے۔ بیسل اور برن میں 2000 میں مسلم سکوائرز عطا کئے گئے اور لوگانو میں 2002 اور زیورک میں 2004 کے دوران الگ مقامات کی نشاندہی کی گئی۔

سوئٹزر لینڈ میں مسلمان آبادیوں کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی حلقے آج بھی قومیت کے تصور سے مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری ثقافتوں میں رہتے ہوئے بھی میزبان ثقافت کو قبول کرنے کے تیار نہیں ہوئے۔ مسلمان آج بھی اسلام کی ایسی شکل سامنے لانے میں کامیاب نہیں ہوئے جس میں ثقافتی خصوصیات یا معاشرتی خال وخد اپنانے کی گنجائش موجود ہو۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں دوسری یا تیسری نسل نئے ثقافتی اور معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔

سوئٹزر لینڈ میں عبادت گاہوں کا قیام 1980 میں عمل میں آیا اور ان کا مقصد خاندانی گروہوں میں وسعت لانا تھا۔ اس وقت سوئٹزر لینڈ میں 200 سے زیادہ مسلم سنٹرز ہیں جو ہر قسم کے مذہبی رجحانات رکھنے والوں کو عبادت کی جگہ فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سے چار مراکز پر مینار تعمیر کئے گئے ہیں۔ گذشتہ 15 سالوں میں ایک مرکزی (umbrella) اسلامی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جسے عصر حاضر کی ایک اہم اختراع سمجھا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ سب ادارے مل کر بھی سوئٹزر لینڈ کی مسلمان آبادی کی نمائندگی نہیں کرتے کیونکہ صرف ترک نژاد مسلمانوں کی پانچ مرکزی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔

البانوی اور عرب مسلمانوں کے درمیان بھی نمائندہ اتحاد کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے قومی سطح پر تنظیمی ڈھانچہ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی تنظیم سوئٹزر لینڈ میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی نمائندگی کی سکت نہیں رکھتی۔ سوئٹزر لینڈ میں اسلامی تنظیموں کی فیڈریشن[30]، جس کی بنیاد 2006 میں رکھی گئی تھی، اس وقت 130 اسلامی مراکز کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اسلامی تنظیموں کے مابین تعاون قائم کرنے کے لئے تشکیل دی جانے والی ایک مرکزی تنظیم[31] کا قیام 2000 میں عمل میں آیا تھا اور اس تنظیم کی صدارت اہلِ تشیع مسلمانوں کے پاس ہے۔

واضح رہے کہ سوئٹزر لینڈ میں اہلِ تشیع مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان تنظیموں اور مرکزی تنظیموں کے علاوہ سوئٹزر لینڈ میں مسلمان خواتین کی تنظیم اور لیگ آف مسلم ان سوئٹزر لینڈ جیسی تنظیمیں بھی موجود ہیں۔ تنظیم سازی کے کامیاب اقدامات مقامی، ٹاون اور ضلعی سطح پر اٹھائے گئے ہیں جہاں مقامی مسلمان طبقات بنیادی نوعیت کا تنظیمی ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں تاکہ مقامی سوسائٹی اور مقامی حکام کے ساتھ مکالمے کے عمل کو موثر بنایا جا سکے۔ 2002 عیسوی سے جینوا، واوڈ، فریبرگ، زیورک اور لوسرن میں مرکزی نوعیت کے تنظیمی ڈھانچے وجود میں آ چکے ہیں۔

[30] The Federation of Islamic Organisations in Switzerland (FIDS/FOIS)
[31] The Coordination of Islamic Organisations in Switzerland (KIOS)

ثقافتی چیلنج

مغرب میں اسلامی تعمیرات

ستیفن لاثائن

یورپ میں جہاں بھی مسلمانوں نے مذہب اور ثقافت کو الگ الگ خانوں میں رکھا ہے وہاں ان میں فنکارانہ تخلیق کے سرچشمے پھوٹے ہیں۔ اس لئے ہمیں یورپ میں اسلامی تعمیرات کی کوئی ایک اصول بند شکل دکھائی نہیں دیتی جو یہ بتاتی ہو کہ اسے کسی غیر لچکدار تعمیراتی احکامات کی پیروی کرتے ہوئے تخلیق کیا گیا ہے۔ گوناں گوں تعمیراتی روایات آزادانہ مذہبی روشوں اور تخلیقی عمل کی غمازی کرتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے مغرب میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہر گز نہیں تھا کہ اسلام ایک خاص ثقافتی نمونہ بھی ساتھ لائے گا جس کی ہر حال میں پیروی کی جائے گی۔

ایڈن برگ مسجد

اس باب میں ہم اس تاریخی حقیقت پر روشنی ڈالیں گے کہ تعمیراتی تخلیق اسلامی تعمیرات کا حصہ اور ثقافتی اثر و نفوذ کا باعث رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں یورپ میں مساجد کی تعمیر کے موجودہ تناظر میں اسلام کے مغربی شکل اختیار کرنے کی راہ میں حائل رکاوٹوں یا حدود پر بھی بات کی جائے گی۔

ثقافتی تبادلہ: اسلامی تعمیرات کا مستقل اصول

تاریخ کے ہر دور میں، مسلمانوں نے نئے مقامات اور ثقافتوں کے فنون اور احسن پہلو اپنائے ہیں۔ مشرق میں ایشیا ہو یا پھر شمالی افریقہ یا پھر مغرب میں یورپ۔ مسلمانوں نے مقامی فنون کو نہ صرف اپنایا ہے بلکہ انہیں، اپنے ذوق اور رجحانات کے مطابق، مناسب شکل دی ہے۔

مسجدِ قرطبہ کا اندرونی منظر۔ مشہور محرابوں اور ستونوں کے ساتھ

اپنی ابتدا ہی سے، اسلام ایک کثیر الثقافتی دنیا کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایران اور بازنطینی سلطنتیں روبہ زوال دکھائی دیتی ہیں۔ ان دونوں سلطنتوں کے تعمیراتی علوم کے علاوہ علم نجوم، طبیعات اور طب پر یونان پر رومۃ الکبریٰ کے ثقافتی اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیغمبرِ اسلام اور ان کے ساتھی اپنے ساتھ رہنے والے یہودی، مسیحی اور مجوسیوں کے عقائد سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ نتیجتاً اسلامی "تہاذیب" ان ثقافتی اثرات کے زیر اثر پھلی پھولیں اور پروان چڑھیں۔

ثقافتی "لین دین" کے اس سلسلے نے ، دیگر شعبوں کی طرح، تعمیرات کے شعبے کو بھی متاثر کیا۔ ثقافتی اثر و نفوذ کو ثابت کرنے کے لئے سلطنتِ ایران کی مندرجہ ذیل دو مثالیں قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں:

ایوان: ایک وسیع محرابی (بعض صورتوں میں گنبد پر مشتمل) ہال جو ملحقہ صحن میں کھلتا ہے۔

چہار طاق: جفتہ (جوڑ بند) کی بنیاد پر تعمیر کردہ عمارت جو چار محرابوں پر کھڑی ہو اور دیگر عمارتوں، خاص طور پر ایوان، کے ساتھ جڑی ہو۔

اسلامی فنِ تعمیر میں دیگر ثقافتوں سے کسبِ فیض حاصل کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے بھی بہت سے خطوں کو محض ظاہری طور پر اسلام کے رنگ میں رنگا گیا تھا۔ یہ اسلامی رنگ محض چھاونیوں کی تعمیر تک محدود رہا اور مسلمان ماہرین تعمیرات مقامی آبادی سے فن تعمیر کے نت نئے طریقے سیکھتے اور انہیں استعمال میں لاتے رہے۔

اس طرح اسلام میں داخل ہونے والی نئی ثقافتوں کے اثرات اسلامی فنِ تعمیر کا حصہ بنتے چلے گئے۔ اسلامی حکومتوں نے تعمیرات کے دوران نہ صرف مقامی تعمیراتی منصوبہ بندیوں کا احترام کیا بلکہ ایسے تعمیراتی مواد کا استعمال کیا جو نومسلم معاشروں میں موجود تھا۔ سپین کے شہر طلیطلہ[32] میں واقع ہونے والی تبدیلی صدیوں کے ثقافتی اثرات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی طرح بیت المقدس میں ضَریح [33] کا مقدس کلیسا قسطنطین کے دور میں ایک جفتہ بند عمارت پر قائم تھا اور اس کی شکل مسجد القبہ [34] سے ملتی تھی۔

بازیلیکا ہاجیہ سوفیہ۔ قسطنطین کی فتح کے بعد 532 میں تعمیر ہوا۔ بعد ازاں اس عمارت میں مینار شامل کرکے اسے مسجد کی شکل دی گئی۔

تاہم اس کا نقش اور ڈیزائن شام اور فلسطین کے مسیحی فنون کے اثرات کا اظہار ہے۔ مسلمان جانتے تھے کہ ایک عمارت کو اسلامی نسبت کس طرح عطا کی جائے اور اسے اسلامی علامت میں کیسے بدلا جائے۔ اسی داستان کی گونج قرطبہ کی مسجد اور کیتھیڈرل کے مشاہدے پر سنائی دیتی ہے اور یہی مثال استنبول میں سینٹ سوفیہ کے بنائے ہوئے بازیلیکا [35] پر، جسے بعد ازاں مسجد کی شکل دی گئی، بھی صادر آتی ہے۔ مسلمانوں نے مختلف علاقے فتح کرنے کے بعد مسیحی عبادت گاہوں کو، بعض اوقات جبراً، اسلامی شکل دی۔ تاہم یہ امر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلام، اختراعی لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے، فتوحات کے ذریعے پہلے سے موجود مذہبی روایات کی عکاسی کرنے والی عمارات کو ایک نئی شکل عطا کرتا رہا ہے۔

---

[32] Toledo
[33] Sepulchre
[34] Dome of the Rock

[35] Basilica۔ بہت بڑا کلیسا جس کے اندر ایک ہال ہو۔ عربی زبان میں البا سیلیقا کہا جاتا ہے۔

اسلامی توسیع پسندی کی ایک صدی کے دوران مساجد کی شناخت علامتی اور عملی مقام کی حیثیت سے برقرار رہی۔ ان مساجد میں مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے لوگ عبادت کیا کرتے تھے۔ شمالی افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، برصغیر (پاک وہند)، چین اور اناطولیہ میں اسلامی عہد کے دوران بھی ان تمام سرگرمیوں میں مقامی ثقافت کا رنگ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

19 ویں صدی کے دوران، یورپی نوآبادیاتی توسیع پسندی نے مسلم دنیا پر گہرے سماجی اور سیاسی نقوش مرتب کئے۔ اس دوران، خاص طور پر مصر اور الجیریا کی لاتعداد یونیورسٹیوں اور فنون لطیفہ کے سکولوں میں یورپی تعمیراتی علوم کی تعلیم دی جانے لگی۔ ان اداروں میں دی جانے والی تعلیم نے طلبا کو دنیا دیکھنے کا ایک نیا اسلوب اور ڈھنگ دیا۔ اس کے علاوہ مسلمان طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد لندن، پیرس، برلن اور روم کی یورپین یونیورسٹیوں میں تعمیرات کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ یہاں انہوں نے محسوس کیا کہ تعمیرات کے جدید نظریات کا اطلاق مسلم دنیا کے تعمیراتی منصوبوں پر کیا جاسکتا ہے۔

فیصل مسجد اسلام آباد: پاکستان کی سب سے بڑی مسجد جو سعودی عرب کے تعاون سے تعمیر ہوئی۔ روایت پسندوں نے اس مسجد کے ڈایزائن کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا کیونکہ اسے روایتی گنبد کی بجائے بدوی خیمے کی شکل میں بنایا گیا۔ مسجد کی تعمیر کا آغاز 1976 اور تکمیل 1986 میں ہوئی۔

فن تعمیر میں جدید زاویے اور نئے افق دریافت کرنے کی بنیادی خواہش نے دوطرفہ ثقافتی تبادلے کو ہوا دی۔ لی کوربوزیر اور گروپیس اس سلسلے میں درست دکھائی دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے نہ صرف مشرقی تعمیرات میں دلچسپی لی بلکہ جدید تعمیرات میں مشرقی رنگ شامل کیے جو تعمیرات کے کلاسیکی ماڈلز کو جدت سے ہم آہنگ کرنے کا باعث بنے۔ مساجد کی تعمیر کو جدت سے ہم آہنگ کرنے والوں میں ایرانی جہانگیر مظلوم (ایرانی ڈیزائنر جس نے ایران میں مسجد الغدیر کا ڈیزائن مرتب کیا) اور ویدات ڈیلاکوئے (جس نے اسلام آباد کی فیصل مسجد کا ڈیزائن بنایا) شامل ہیں۔

اکیسویں صدی میں گلوبلائزیشن کا رجحان بھی تعمیرات کی دنیا میں مختلف ثقافتوں سے کسبِ فیض حاصل کرنے کی روایت میں تیزی لانے کا باعث بنا ہے۔ اس لئے تعمیرات کے تناظر میں بھی اسلام کو سکہ بند اور غیر لچکدار مذہب قرار نہیں دیا جاسکتا ہے جو کہ کسی بھی قسم کے ثقافتی تبادلے کی ممانعت کرتا ہو۔

ثقافتی اصولوں سے انحراف؛ اسلامی تعمیرات میں اختراع اور تخلیق کی بنیاد

اسلام کے مغرب میں داخل ہونے سے ثقافتی تبادلے کی روایات مضبوط ہوئیں۔ مغرب کے اسلامی فنِ تعمیر پر مرتب ہونے والے اثرات کو تین رجحانات کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے؛ تمام ثقافتی روایات کو پس پشت ڈالنا، مغربی ثقافت کو اپنانا یا پھر نئے معاشروں کی ثقافت سے کچھ خصوصیات مستعار لینا اور (اسلامی) ثقافتی اصولوں سے شعوری انحراف کی مدد سے اختراع اور ایجاد کے عمل کو تقویت دینا۔ ثقافتی اصولوں سے انحراف کا مطلب ڈیزائنر

مسجد حسن ثانی کاسا بلانکا. میناروں کے ساتھ افریقہ کی سب سے بڑی مسجد سمجھی جاتی ہے ۔ اسے بادشاہت کے جاہ و جلال کی نشانی سمجھا جاتا ہے. تعمیراتی لحاظ سے یہ مسجد روایت ، جدت اور مقامی ثقافت کا حسین امتزاج ہے.

کے ذاتی تخلیقی اور جمالیاتی رجحانات کا روایت پر غالب آنا اور ایسی تخلیق سامنے لانا ہے جو اپنی ثقافت کے جمالیاتی شعور کو نئے زاویوں سے روشناس کرا رہی ہو۔ بوردو مسجد[36] کے امام طارق اوبرو کے مطابق:

"مسجد کی عمارت کو دنیا کے کسی شہر کی ثقافت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے لازم ہے کہ مسجد کی تعمیر کے دوران روایتی ثقافتی پابندیوں کو ہرگز ملحوظِ خاطر نہ رکھا جائے"۔

یہ ثقافتی خالی الذہنی کے اصول کے عین مطابق ہے جسے ایک جدت پسند مسلمان اور قدامت پسند سلفی دونوں قبول کرتے ہیں۔ دونوں ایسی ثقافت میں اختراع کے قائل ہیں جو ان کے نزدیک پسماندگی اور توہم پرستی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور وہ مذہبی نوعیت کے خالص اسلام کی جانب راغب دکھائی دیتے ہیں جو تاریخی اثرات سے پاک ہو۔

مسجد الشاکرین ملائشیا. پس منظر میں ملائشین آئل اور گیس کمپنی پیٹروناس کے جڑواں ٹاورز نمایاں نظر آتے ہیں.

ثقافتی اثرات کو قبول کرنے کا مطلب میزبان معاشروں کے جمالیاتی شعور کو اپنانا ہے۔ بوسنیا میں ویسوکو کی سفید مسجد (مسجد الوان) یورپ میں اسلامی تعمیرات کی ایک بہترین مثال ہے۔ میزبان معاشروں کی ثقافت کو اپنانے کا مطلب عبادات کے لوازمات (منبر، قبلہ، اندرونی میدان، وضو اور طہارت کے مقامات اور میناروں وغیرہ) کو تعمیراتی اختراعات اور تخلیق کے ذریعے یورپی ثقافتی پس منظر اور ضروریات سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

میزبان معاشروں میں پرانے ثقافتی اصولوں سے انحراف کا مطلب اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے آپ کو نئی شناخت[37] فراہم کرنا ہے۔ مساجد کی تعمیر کرنے والے بہت سے ماہرینِ تعمیرات، جن میں سے بیشتر غیر مسلم ہیں، مثال کے طور پر پاؤلو پر تیغیز نے، جنہوں نے روم اور سٹریسبرگ کی مساجد تعمیر کیں، ایک انٹرویو میں لازاری عبدائم کے ساتھ مل کر کہا ہے کہ ان کا تعمیراتی مقصد بنیادی تعمیراتی ساخت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اندرونی ستونوں کا خاتمہ کرنا ہے تاکہ یہ ستون بصری عمل میں رکاوٹ کا باعث نہ بنیں اور گنبد کا بھی خاتمہ کرنا ہے۔ میں نے کچھ Tuaregs لوگوں کو صحرا میں عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی علامتی دیوار کو مسجد تصور کرتے ہوئے عبادت میں مشغول تھے۔ میں اس سے ملتی جلتی مسجد تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی توجہ ایک سرچ لائٹ پر بھی مرکوز کی ہے۔ روم کے لئے میں مخصوص

[36] Bordeaux Mosque
[37] DIY identities

ابوظہبی: ایک منفرد تعمیراتی نمونہ۔ مسجد کو انتہائی جدید شہری علاقے سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

تعمیراتی مواد کا استعمال کیا ہے۔ گنبد کے لئے سیسہ اور دیواروں کے لئے اینٹ۔ سٹریسبرگ کی مسجد کے لئے میں سنگ ریگ اور کاپر استعمال کرنا چاہوں گا جو کہ الزاس کی عمارتوں میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میں میناروں کے لئے کونیاتی چھت کی تعمیر کا بھی سوچ رہا ہوں۔

ثقافتی تبادلے کے علاوہ مساجد عبادت گاہوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اور ثقافتی دنیا کی یادگار کے طور پر بھی۔ دیکھا گیا ہے کہ مسلمان مہاجرین کی پہلی نسل ایسی روایتی مساجد بنانے کے حق میں ہوتی ہیں جو ان کے اپنے ممالک میں تعمیر ہونے والی مساجد سے ملتی جلتی ہوں۔ الجیریا کے لوگوں کے زیرِ اثر پیرس میں بنائی جانے والی مسجد کو اس سلسلے میں ایک اہم مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یورپ اسلامی فنِ تعمیر کے لئے ایسی گزر گاہ ہے جو کامیابی کی لاتعداد منازل تک رہنمائی کرتی ہے۔ جہاں ماہرین تعمیرات کو یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن کی تعمیراتی اور فنی روایات کو ایک نیا چہرہ عطا کر سکیں۔

ایک طرف اسلام کو کسی مخصوص نظریات کا قیدی بنا دیا گیا ہے تو دوسری طرف اسے مقامی ثقافتی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یورپ میں مقیم مسلمانوں کے تناظر میں دوسری آپشن زیادہ واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ اس سے مسلمانوں کی ایسی دوسری نسل کی ضرورت کھل کر سامنے آتی ہے جو تعمیرات کے ذریعے یورپی مسلمانوں کی شناخت پر اکتفا کرتے ہوئے ایک نئی جدید اور یورپی مسلم شناخت کو جنم دے۔ ایسی نسل جو اپنی عبادت گاہوں کے ذریعے دوہری شناخت کا اظہار بھی کرے اور شعوری طور پر اس رنگا رنگی کی متلاشی بھی ہو۔ محض تعمیراتی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو آنے والے وقتوں میں اسلامی طرزِ تعمیر میں روایت پسندی کا رجحان اقلیتی رجحان کی شکل اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔

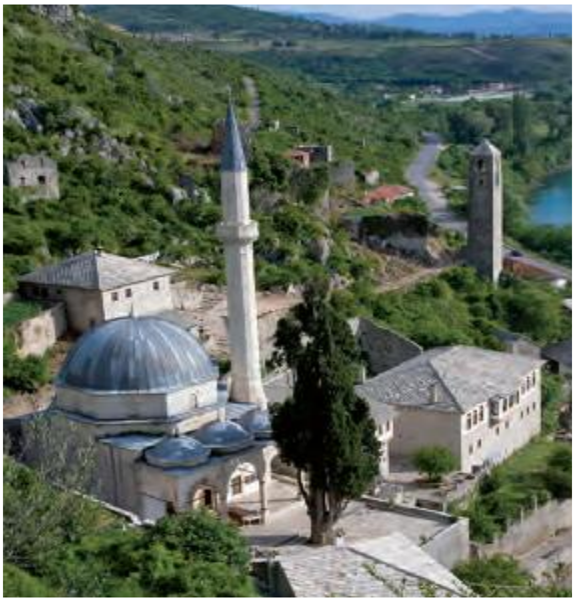

بوسنیا: یہ مسجد 15 ویں صدی عیسوی میں تعمیر کی گئی تھی۔

شمالی فرانس میں راوبیکس کے مقام پر منصوبے کا آغاز کرنے والوں نے مسجد کو مقامی رنگ دینے پر اسرار کیا۔ اس طرح یہ منصوبہ ان کی اساسی ثقافتوں سے ماوراہو کر مسجد اور اس کی علاقائی شناخت کا سنگم ثابت ہوا۔

”ہمارے منصوبے مختلف تناظرات اور نکتہ ہائے نظر سے عظیم وبلند ہوتے ہیں۔ ہم مسجد کے روایتی تصور کو بدل کر اسے شہر کی تعمیراتی تاریخ کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ یہ مسجد اس شہر میں بسنے والے تمام شہریوں کی مسجد ہے۔ ایک ایسی مسجد جس پر ہر مومن فخر کرے گا اور اس شہر میں رہنے والا ہر شہری اسے اپنے شہر کی ثقافت کا امین سمجھے

گا"۔(اسامہ بیزازی) [38]

مقامی ردِ عمل

مزاحمت اور تعاون کے مابین

آکسفورڈ مینار

تعمیرات سے ہٹ کر یا بڑھ کر معاشرے ہیں۔ مسجد کی تعمیر اپنے ماحول سے مذاکرات اور باہمی افہام و تفہیم کے عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ مذاکرات اور بات چیت مختلف منظرنامے جنم دے سکتی ہے۔ تاہم میانہ روی کا سنہری اصول اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خارجی ماحول سے مذاکرات کے دوران کشیدگی میں کمی آئے، خطرناک نتائج کے دباؤ سے بھی بچا جاسکے اور مناسب سیاسی ماحول (دائیں بازو کے قدامت پسندوں کی تعداد کم اور باہمی سلامتی کی صورتحال) کی شرط بھی پوری ہو رہی ہو۔ یہاں پر ہم جرمنی کی مثال لیتے ہیں۔ ڈسبرگ مسجد کا افتتاح 2008 میں ہوا۔ اسے ہم یورپ میں مسجد کی تعمیر کا مثالی عمل قرار دے سکتے ہیں۔ منصوبے کے آغاز سے ہی، مسلمان رہنماؤں نے حکام سے بات چیت کا آغاز کر دیا۔ ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل پائی اور اس کمیٹی میں مختلف مسلمان، مذہبی طبقات اور مقامی رہائشیوں کے نمائندگان نے شرکت کی۔ اس نے ثابت کیا کہ باہمی اعتماد کی صورتِ حال کس طرح پیدا کی جائے گی اور مختلف گروہوں کے مابین تعصب کو کس طرح ختم کیا جائے گا۔

اس مسجد میں 23 میٹر کا مفصِل اور مینار کی لمبائی 34 میٹر ہے۔ ڈسبرگ مسجد کا ڈایزائن سلطنتِ عثمانیہ کی مساجد سے متاثر ہو کر تیار کیا گیا ہے اور یہ مسجد جرمنی میں موجود باقی مساجد کے مقابلے میں بڑی ہے اور یہاں 1200 سے زیادہ عبادت گذار ایک وقت میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ شہر کے شمال میں موجود یہ مسجد کامیاب تعاون کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس کی تعمیر کے دوران اور بعد میں کسی تنازعے نے جنم نہیں لیا۔

پیرس مسجد۔ الجیریا کی ریاست نے تعمیر کروائی۔ الجیریا میں فن تعمیر پر فرانسیسی نو آبادیاتی دور کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

کلون کی مسجد کی مثال تھوڑی سی مختلف ہے۔ دو سال کی کشیدگی کے بعد، ٹاؤن کو شہر کے وسط میں مسجد کی تعمیر کی اجازت دینا پڑی تھی۔ مسجد تعمیر کرانے والوں کے منصوبے کے مطابق اس مسجد نے ڈسبرگ کی مسجد سے بھی کشادہ ہونا تھا۔ اس پر دو مینار تعمیر کئے جاتے جن کی لمبائی 55 میٹر ہوتی۔ اس پر مقامی شہریوں کو اعتراض تھا۔

اس منصوبے کے ایک مخالف، مارکاس ویز، کا کہنا تھا:

---

[38] *La Voix du Nord*, 28 September 2008

شمالی فرانس کے قصبے ایسکاوڈائن میں تعمیر کی گئی ایک مسجد۔ یہ مسجد اس علاقے میں قائم ہے جو صنعتی علاقہ ہونے کی وجہ سے بنجر ہوچکا تھا۔

''اتنی بڑی عمارت کی تعمیر ہم آہنگی کے عمل کی علامت ہر گز نہ ہو گی۔ اس شہر میں مسلمانوں کے لئے عبادت کے اور بھی مقامات موجود ہیں''۔

شہر کے میئر نے کہا:

''مسجد کی تعمیر کا مقصد اسلام کی اس شناخت کو شہر کے مضافات سے نکال کر ایک پر وقار مقام دینا ہے۔ شہر کے عین قلب میں مسجد کا وجود مسلمانوں کو جرمن معاشروں سے ہم آہنگ اور مربوط کرنے کا باعث بنے گا''۔

مسجد کی تعمیر کے لئے چنے گئے ضلع کے میئر بھی اس بات سے متفق دکھائی دیے:

''میں اس بات سے متفق ہوں کہ نئی مسجد فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہو گی۔ سیاحوں سے بھری ہوئی بسیں اس مسجد کو دیکھنے کے لئے آئیں گی۔ جو لوگ کیتھڈرل دیکھنے آئیں گے، وہ اس عالیشان مسجد کو بھی ضرور دیکھیں گے۔ یہ مسجد ایک نیا اسلامک سنٹر بنے گی''۔

فرانس: ڈسبرگ مسجد کا بیرونی منظر

فرانس میں پوئٹیرز کے مقام پر ایک مینار کی تعمیر مسلم اور غیر مسلم آبادی کے درمیان وجہ نزاع بن چکی ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کے منتخب شدہ رکن عبد الرزاق حالومی کے مطابق مینار مسجد کا لازمی جزو ہر گز نہیں۔ تاہم تنازعے کی وجہ مینار ہر گز نہیں۔ مسجد عبادت کا مقام ہے اس کا شہر کے لئے کھلا ہونا اور جمالیاتی تقاضے پورا کرنا لازم ہے۔ مسجد کی تعمیر کا کام جاری ہے (نیچے فوٹو ملاحظہ فرمائیں۔ یہ فوٹو اپریل 2009 میں لیا گیا تھا)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کا کام ماحول سے ہم آہنگ ہونے اور مذاکرات کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ عمل کسی بھی نتیجے کا حامل ہو سکتا ہے۔ زیادہ تر امکان یہی ہوتا ہے کہ بات چیت اور باہمی افہام و تفہیم کا نتیجہ رضامندی کی صورت میں نکلتا ہے جب تک مذاکرات کے عمل میں ایسے شرکا (جماعتیں یا افراد) شامل نہ ہوں جو نظریاتی طور پر اسلام کی مخالفت کرتے ہوں۔

جینوا مسجد سوئٹزرلینڈ. اسلامی طرز تعمیر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

مینار اور مساجد

زیورک، جینوا، ونٹر تھر اور وینجن

سوئٹزر لینڈ میں زیورک اور جینوا میں دو تاریخی مساجد موجود ہیں اور دونوں کے مینار ہیں۔ اس لئے یہ مساجد میناروں کے سلسلے میں ہونے والی مباحث سمجھنے کے لئے مدد گار ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ مینار مساجد کی تعمیراتی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں اور اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ضلع کی شہری حدود سے ہم آہنگی کا کیا مطلب ہے۔

زیورک کی مسجد 1970 کے جدید رہائشی فنِ تعمیر کی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس پر استوار ایک سفید مینار 22 میٹر لمبا ہے۔

جینوا میں، پیٹٹ سائکونکس کے مقام پر، شہری مراکز سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک رہائشی طرز کی عمارت پر شیشے کی مفصل کے ساتھ ایک مینار استوار ہے۔ اس اسلامک سنٹر کی تعمیر کے دوران معماروں اور عوامی حکام نے اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پرانی عمارت کو نئی عمارت سے یکجا کیا جائے۔ پرانی عمارت میں ایک منارچہ موجود ہے۔ پرانی دیواروں پر کام کر کے انہیں 17 ویں صدی کی تعمیراتی جمالیات سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ یہ عمارت اسلامی فن تعمیر کے کلاسیک دور کی یادگار اور اردگرد کے ماحول کا اٹوٹ حصہ دکھائی دیتی ہے۔

جینوا مسجد سوئٹزرلینڈ. تجدید کے بعد مسجد اپنے ماحول کا حصہ دکھائی دے رہی ہے .

ہیمبرگ مسجد

یورپی مساجد

جب اسلامی فنِ تعمیر یورپ میں داخل ہوا تو اس پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ یورپ میں موجود مساجد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم ثقافت نے تو مغربی شکل اختیار کر لی ہے لیکن اسلامی عقائد تجدید کے عمل سے نہیں گذرے۔ مسلم فنِ تعمیر، جہاں تک عبادت گاہوں کی تعمیر کا تعلق ہے، ثقافتی اثرات قبول کرنے کے لئے تیار رہا ہے۔ کیونکہ فن تعمیر ایک ثقافتی معاملہ ہے۔ ثقافتی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس وقت ہمیں مکہ کولا، اسلامک رائپ موسیقی اور قاہرہ، لندن اور سنگاپور کی بوتیک میں بکنے والے سٹائلش سکارف دکھائی دیتے ہیں۔ ثقافت اور عقائد کے مابین یہ تضاد ظاہر کرتا ہے کہ

گلاسگو مسجد

اسلام کا مغرب میں داخل ہونے کا مطلب مذہبی عقائد کی تجدید ہر گز نہیں۔ اسلام کی مغرب میں موجودگی اس بات کی غمازی ہر گز نہیں کرتی کہ ایک بنیاد پرست "خالص مذہب" کی تلاش کے لئے پیچھے نہیں دیکھے گا۔ اس لئے مغرب میں اسلامی تعمیرات پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں پوچھا جانے والا سوال مختلف معانی و مطالب کا حامل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بات کی گئی ہے، مسجد اسلامی تعمیرات کو از سر نو تخلیق کرنے کا نام نہیں۔ فنِ تعمیر ثقافتی اثرات لازمی طور پر قبول اور کچھ قائم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی تبدیلی کے دور سے گذر رہے ہیں۔ امیگرنٹس کی پہلی نسل اپنے اصل وطن کی ثقافت سے جڑی رہتی ہے۔ تاہم فنِ تعمیر، شہری منصوبہ بندی کی طرح، کبھی جمود کا شکار نہیں ہوتا بلکہ متحرک رہ کر سماجی ترقی کا آئینہ دار بنتا ہے۔

مذہبی تقدس ماہرین تعمیرات اور معماروں کی پسندیدہ تھیم رہی ہے

برمنگھم مسجد

دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کی طرح مسلمانوں نے مذہبی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کے تعمیراتی حل تلاش کرنے میں دلچسپی لی ہے۔ ماہرینِ تعمیرات کے تخلیقی تصورات کی راہ میں مالی وسائل اور ریاستی مداخلت آج بھی حائل ہو سکتی ہے۔ تاہم اس وقت زیادہ سے زیادہ مسلم تنظیمیں مذہبی انتظام کاری کے سلسلے میں شفافیت اور خود انحصاری کے اصول مدِ نظر رکھتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پس منظر مسلمانوں کے اعمال و افعال، عقائد اور مذہبی مقامات پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم مسیحیت، بدھ مت اور یہودیت پر یہ اثرات واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ اثر پذیری کے اس سلسلے کا آغاز ہو چکا ہے۔

سٹاک ہوم مسجد

ڈانیان شمالی فرانس کی ایک مسجد جو قصبے کے عین وسط میں واقع ہے۔

ہمیں کثیر الاثقافتی نظریات کا شکار نہیں ہونا چاہیے

پیٹرک حائینی

آسکر فریسنجر — وفاقی ضلع میں یو۔ڈی۔سی پارٹی کے بانی، پارلیمنٹ کے رکن اور مصنف ایک عوامی مقرر کے طور پر جانے مانے جاتے ہیں اور ان پر اکثر عوامی پھکڑ پن کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ان کی ویب سائٹ کے مطابق ان کا کام مشکل سوالات پوچھنا ہے۔ وہ زیادہ تر امیگریشن کے غیر تسلی بخش نظام سے خفا دکھائی دیتے ہیں۔

وینجن میں میناروں پر بات چیت کے دوران، جب عوام کو میناروں کے مسئلے پر سوچنے کو کہا گیا اور اس کی شدید مزاحمت بھی ہونے لگی، آسکر فریسنجر اسلام سے وابستہ خطرات سے آگاہ ہوئے۔ وہ آئنٹریپ میں ان "مسلمان اضلاع" کو یاد کرتے ہیں جہاں لاقانونیت کا دورِ دورہ تھا۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں شریعہ کا نفاذ ہو چکا تھا۔

ان تجربات کو ذہن میں رکھتے ہوئے، وہ اس کمیٹی کا حصہ بنے جس کا آغاز شہریوں کے اقدام نے کیا تھا۔ آسکر فریسنجر اس بات سے واقف نہیں تھے کہ میناروں پر پابندی کا اقدام منظور ہو جائے گا۔ ان کے نزدیک "سیاسی طور پر درست" نظام کی طرف سے سامنے آنے والی مزاحمت، جو کسی بھی مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی راہ میں حائل ہوتی ہے، موضوع کا رُخ بدل دے گی۔ تاہم میناروں کا مسئلہ اس قدر اہم تھا کہ اس سے ایک بحث نے جنم لے ہی لیا۔

اس بحث کا موضوع مینار نہیں تھے بلکہ اسلام تھا۔ اسلام جو کہ آسکر فریسنجر کے نزدیک "عقائد اور قبیلہ پرستی کا دھماکہ خیز ملغوبہ ہے" جو ایسی احتجاجی تحاریک کو یکجا کر رہا ہے جو متبادل معاشروں اور نچلے درجے کے محلے کی تلاش میں ہوں۔ اسلام، آسکر فریسنجر کے نزدیک، ایک توسیع پسندانہ نظریہ ہے جو، خطرناک حد تک تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ، ہنوز خرد افروزی اور روشن نظری کا منتظر ہے۔

تاہم آسکر فریسنجر نے مسلم آبادی پر بات کرنے کی بجائے مذہبی ذہنیت کو نشانہ بنایا ہے جو آج تک "آئینی ریاستوں سے معاملات طے کرنے میں ناکام رہی ہے"۔ اگر ایسا ہے تو، آسکر فریسنجر کے نزدیک، اسلام عقائد پر مبنی ایسے جنگ و جدل کا نام ہے جس میں معتدل طاقتوں کو بہت جلد ہار ماننی پڑتی ہے کیونکہ "مناظروں کے دوران مذہبی کتب کے لفظی اور ظاہری تراجم کے ذریعے فریق مخالف کا منہ بند کر دیا جاتا ہے"۔

آسکر فریسنجر کے نزدیک یہ دلیل کہ انتہا پسندوں کی تعداد نہایت کم ہے دو وجوہات کی بنا پر قائل کر دینے والے دلیل ہر گز نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی اقلیت خوف کا شکار ہو کر بھی طاقتور ہو جاتی ہے۔ اس پر آسکر فریسنجر ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ چیکوسلاواکیہ اور نازی جرمنی میں نام نہاد اقلیت کس طرح اکثریت پر غالب آگئی۔ دوسرا یہ ہے کہ "اقلیت" کوئی مستقل زمرہ نہیں ہے۔ فرانس میں ہر سال مسلمانوں کی تعداد دوگنا ہو رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخر کار مسلمان اپنی خواہشات کے ریاستی اطلاق پر زور دینے لگیں گے۔

اس مقابلے اور پیکار کا نتیجہ بنیادی طور پر آمرانہ نکلے گا کیونکہ انتہا پسند بے رحم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جیت جائے گا۔ عقیدہ پہاڑوں کو سر کا دیتا ہے اور یہ پہاڑ عام طور پر لاشوں کے انبار ہوتے ہیں"۔

اس عقیدے کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے جس کے ساتھ مل کر آسکر فریسنجر میناروں پر پابندی کی حمایت کر رہے ہیں؟ میناروں پر پابندی کے معاملے میں وہ اناجیلی فرقوں کے ساتھی ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اناجیلی کٹر عقیدہ پرست واقع ہوئے ہیں جن کے نزدیک سوئٹزرلینڈ خالصتاً مسیحی ملک ہے"۔

تاہم یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اس لئے کہ یورپ میں مسیحی آبادی خود اپنے آپ کو کم کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسیحی روایات کے امین ڈیموکریٹس ہر ملک میں موجود ہیں کیونکہ مسیحیت نے اپنے آپ کو ریاست سے الگ کر لیا ہے۔ "اسلام اس کے برعکس ایک الگ تھلگ نظریاتی جزیرہ ہے جو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں ناکام رہا ہے کہ سیاست مذہب سے الگ رہ کر بھی باقی رہ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام پر آج بھی انتہا پسندانہ تشریحات کا غلبہ ہے۔ اس طرح اسلام ہماری ثقافت کو للکار رہا ہے۔ ہماری ثقافت ایک باریک اور مہین غلاف ہے جو بہت تیزی سے چاک ہو سکتا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے خبردار رہنا لازم ہے"۔

آسکر فریسنجر کی دلیل کی روشنی میں اس نظریاتی آماجگاہ میں ہر مینار ایک موذن اور اذان کا تقاضا کرے گا جبکہ سیاسی طور پر متحرک مسلمانوں کا خیال ہے کہ انہیں موذن کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں موذن کے بغیر مینار بے معنی ہے۔ سیاسی طور پر متحرک مسلمانوں کے یہ خیالات، آسکر فریسنجر کے نزدیک، ایک کھلے تضاد کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

آسکر فریسنجر کے نزدیک میناروں کی تعمیر کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے کیونکہ مسئلہ کی بنیاد کہیں اور ہے۔ "اس تنگ و تاریک دنیا میں مسئلہ کی بنیاد مساجد کے اندر موجود ہے۔ جب قانون سازی کی مدد سے مساجد میں انتہا پسندانہ تعلیمات کی روک تھام نہیں کی جاسکتی، میناروں کی تعمیر کی ممانعت مزاحمت کی علامت سمجھی جائے گی۔ "مینار ایک معصوم علامت نہیں بلکہ اس سے بارُود کی بُو آتی ہے"۔

اس پر آسکر فریسنجر کو سیاسی نظام پر تنقید کا بھی موقع ملتا ہے جو اس کے نزدیک "بزدلوں کے ٹولے" پر مشتمل ہے۔ آسکر فریسنجر کے مطابق "یہ نظام ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں آئینی ریاست اور اس کے وجود کے لئے خطرہ بننے والے عناصر کے پیدا کردہ مخمصے نے مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔۔ یہ لوگ انتہا پسندوں کے لئے سیاسی طرز کے نرم گوشوں اور انتہائی تحمل سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو آخر کار ان کے ایوانوں کو جلا کر راکھ کر دے گا"۔

مغرب کو فتح نہیں کیا جا سکے گا

پیٹرک حائینی، سمیر امغر

شہری اقدام کا دفاع کرنے والوں کے نزدیک اقدام کا مقصد "دعوتِ فکر" اور اس فکر کا مرکزی موضوع اسلامی توسیع پسندی ہے۔ اسلامی توسیع پسندی کا مطلب سیاسی اجارہ داری کا ایک ایسا منصوبہ ہے جو یا تو اسلامی نظریات کا لازمی جزو ہے۔ یہ توسیع پسندی دو طریقوں سے جاری ہے: ایک طرف مسلمان شرحِ پیدائش میں اضافے، تبلیغ اور غلبہ اسلام کے خواب دیکھ رہے ہیں تو دوسری طرف انتہا پسندانہ منصوبوں کی عملی تکمیل کے لئے متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان عقیدہ پرستی وجود رکھتی ہے، تبلیغی سرگرمیوں میں ملوث ہے، عسکریت پسند عناصر کو جنم دے رہی ہے اور اسلام کو ایک ایسے مذہب کے طور پر پیش کر رہی ہے جو انسانیت کو بچانے کا واحد راستہ ہے۔ ایسا نظام جو اسلام کے "سنہری دور" میں سامنے آیا تھا اور یہی دور توسیع پسندانہ عسکری مہمات اور تبلیغی سرگرمیوں کا بھی سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔

تاہم مذہبی خواہشات اور خوابوں کی سودہ گری سے قطع نظر حقیقت اس قدر سادہ نہیں بلکہ نہایت پیچیدہ ہے۔ مغرب میں اسلام پسند منصوبے کام کر رہے ہیں جن کا مقصد، سیلوین بیسن کے نزدیک، "فتح کرنا" نہیں بلکہ "اثر انداز ہونا" ہے[39]۔ ایسے منصوبے ان علاقوں میں نہیں چلائے جا سکتے جہاں مسلمانوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ انہیں اقلیت مانا جاتا ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام کے روایتی مقصد سے محروم ہو کر یہ اسلام پرست گروہ مبلغین کے روپ سامنے آتے ہیں۔ واضح رہے کہ تبلیغی سرگرمیوں کا علاقہ پہلے ہی پاکبازی کا درس دینے والے غیر سیاسی بنیاد پرستوں کے قبضے میں ہے۔ تاہم موجودہ دور میں ان مبلغین کو بھی انتہا پسند بنایا جا رہا ہے۔ انتہا پسند پیدا کرنے کا یہ عمل فرقہ ورانہ خطوط پر جاری و ساری ہے۔ یہ صورتِ حال باہمی جدال کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ موجود سماجی رجحانات، مثال کے طور پر آبادی کی شرح میں کمی اور مذہبیت میں اضافہ انفرادی سطح پر دکھائی دے رہا ہے۔

نہ ریاست نہ اقلیتی محلہ
مغرب میں اسلام پرستوں کی کشمکش

اسلام پرست تنظیمیں جو، الیور رائے[40] کے الفاظ میں "مغرب میں داخل ہو کر مخمصے کا شکار ہو چکی ہیں، اپنے آپ کو اقلیتی گروہوں میں بدل کر مشکل میں مبتلا پاتی ہیں۔ مغرب میں داخل ہونا نظریاتی سطح پر انتہا پسندی کا باعث تو بن رہا ہے لیکن اقلیتی گروہ ہونے کی وجہ سے مسلمان مقامی سیاست کو متاثر کرنے کے قابل نہیں رہے۔

---

[39] *La Conquête de l'Occident: le projet secret des islamistes*, Paris, Seuil, 2005
[40] Olivier Roy, *L'Islam mondialisé*, Paris, Seuil, 2002; translation: *Globalized Islam*, Columbia University Press, 2006

اقلیتی اسلام پرستی سے پس اسلامیت تک

اخوان المسلمون اور ملی گروس[41] مشہور ترین اسلامی تحاریک ہیں۔ یہی دو تنظیمیں ہیں جو اسلام کو سیاسی رنگ دے کر اسے مغرب مخالف قوت کے طور پر سامنے لانے کے لئے جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان دو تحریکوں نے ایسا اجتماعی تخیل پیش کیا جو کہ نہ صرف عالمگیر (مثال کے طور پر یہ کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے) بلکہ غلبے (اخوان المسلمون کے بانی حسن بنّا کے نزدیک اسلام کا مقصد بنی نوع انسان کی رہنمائی ہے) کا درس دیتا ہے۔ تاہم مغرب کبھی بھی ان تحاریک کا تزویری ہدف نہیں رہا۔

مسلمان اپنے ممالک میں شورشوں اور سیاسی زلازل سے تنگ آکر مغرب میں پناہ لینے تو آئے لیکن غلبے یا قبضے کی نیت سے نہیں۔ حسن بنّا کے داماد سید رمضان نے مغرب میں پناہ لی۔ سید رمضان آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر طارق رمضان اور جینوا اسلامک سنٹر کے ڈائریکٹر حانی رمضان کے والد ہیں۔ مغرب میں قیام کے بعد انہیں مغرب سے تعلقات پر نئے سرے سے غور کرنا پڑا۔

اس کے باوجود اخوان کشمکش و پیچ کا شکار ہیں۔ ان کا خصوصی مشن ایک ''اسلامی ریاست'' کی تلاش ہے۔ لیکن مغرب میں اس قسم کی ریاست کے قیام کا امکان سرے سے موجود ہی نہیں کیونکہ مغرب میں اسلام اقلیتی مذہب کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس وقت مسلمانوں کے پاس دو راستے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ ''اقلیتی اسلام پرستی'' کا راستہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تبلیغ کا وہ راستہ اپنایا جائے جسے حانی رمضان نے سوئٹزرلینڈ میں اپنایا ہے۔ دوسرا راستہ خصوصی شخصیات کے طور پر رہنے کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے مسلمان مغرب میں شکر گذار موکل یا صارف کے طور پر رہیں۔

دراصل اخوان بہت تیزی سے مساجد کے اماموں کے طور پر سامنے آرہے ہیں۔ اس وقت یہ ''عظیم مقاصد'' کو خیر آباد کہہ کر تحریک سازی کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ اس وقت وہ ان مسائل (فرانس اور فلسطین میں حجاب وغیرہ) پر بھی بات نہیں کر رہے جو عام طور پر مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے کی وجہ بنتے تھے۔ اس وقت انہیں درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے اور سمجھوتے کی حکمتِ عملی اپنانے کی وجہ سے کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ انہیں تنقید کا نشانہ بنانے والوں کی ایک بڑی تعداد نوجوان مسلمانوں کی ہے جو اپنے آپ کو اخوان سے الگ کر چکے ہیں۔

2005 میں ٹونی بلیر کا حکومتی مشیر منتخب ہونے پر طارق رمضان کو بھی اس کے سابقہ ساتھیوں نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ذاتی رجحانات اور اندازِ فکر بہت تیزی سے دین اور سیاست کے مابین اس تعلق کو توڑ رہا ہے جو بہت سے مسلمانوں کے نزدیک ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔ اس صورتحال کو پس اسلامیت (مابعد از اسلامیت) کہتے ہیں۔ پسِ اسلامیت کا مظہر تین خصوصیات کا حامل ہے: خالص سیاست کی طرف واپسی، خالص مذہب کی تلاش اور ثقافتی اعتدال کاری۔ پس اسلامیت کا پہلا پہلو ''خالص سیاست سے رجوع کرنے کی خواہش'' یامین مارکی اختراع ہے جو 1990 کی دہائی میں فرانسیسی مسلمانوں کے مرکزی رہنما اور سیکولر سیاست پر یقین رکھنے والے عالمِ دین تھے۔

41۔ لفظی ترجمہ ''قومی نصب العین یا قومی نکتہ نظر''۔ ملی گروس یورپ میں ترک نژاد مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت ہے۔

ان کے نزدیک خالص سیاست سے رجوع کرنے کا عمل یورپی (دائیں یا بائیں بازو کی) سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے کا تقاضا کرتا ہے یا پھر برسلز میں لابینگ[42] کرنے کے مترادف ہے (واضح رہے کہ یہاں مسیحی لابی اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا)۔

خالص سیاسی عمل کا نتیجہ غیر مذہبی شناخت کی "تخلیق" کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے اور اس کی مدد سے اسلامی تحاریک کو طول بھی دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ فرانس میں مقامی لوگوں کی جمہوری تحریک[43] جو مقامی طبقات (کمیونٹیز) کی نو آبادیاتی پیمانوں پر تفریق کی شدید مذمت کرتی ہے۔ اس محاذ پر فرد 80 کی دہائی کے "دوست" اور 90 کی دہائی کے "بھائی" کا جانشین ہے۔ واضح رہے کہ 1980 کی دہائی میں نسل پرستی کے خلاف اٹھنے والی تحریک، جس کی قیادت SOS نامی ایک تنظیم کر رہی تھی، کا نعرہ "میرے دوست کو فارغ کرو"[44] تھا۔

خالص مذہب کی تلاش سعودی وہابی / سلفی تحریک کا نعرہ ہے۔ یہ پر جوش فرقہ ورانہ تحریک ہے جو مغربی معاشرے سے مکمل طور پر الگ ہونے کی بات کرتی ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر بہت سے اسلام پرست نوجوان سیاسی عمل کو خالص مذہب کی مسخ شدہ شکل قرار دیتے ہوئے اسے زمین پر خدائی نظام کا انکار سمجھتے ہیں۔ وہابی فرقہ اسلام پرستوں کی سیاسی فریفتگی سے قطع نظر معاشرتی پہلوؤں سے بالکل خالی ہے اور کسی بھی قسم کی معاشرتی اقدار کو جنم یا برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ فرقہ مغرب سے مکمل طور پر قطع تعلقی پر زور دیتا ہے اور یورپ میں اسلام پرست طبقات کو منظم کرنے پر زور نہیں دیتا۔

پسِ اسلامیت کی تیسری خصوصیت ثقافتی اعتدال کاری ہے۔ اس سے مراد ایک بے داغ مسلم شناخت کی تلاش ہے اور یہ ایک انفرادی عمل ہے۔ یہاں "نجات" کے تصور کا محور "اجتماع یا اُمتِ مسلمہ" کی بجائے ایک بار پھر "فرد" ہے۔ اس طرح نجات کا دارومدار فرد کا ذاتی ارتقا پر ہے۔ یہ دور اخلاقی فاتح کا دور ہے جو نہایت تیزی سے عسکریت پسند مسلمان کی جگہ لے رہا ہے۔ ثقافتی اعتدال کاری کا عمل اسلامی ثقافت کو ایک نئی مگر ثانوی شکل دے رہا ہے۔ یہ ثقافت کسی دوسری ثقافت کی ضد نہیں بلکہ پر جوش کلچر کا متبادل اور ہم آہنگی کی علامت ہے۔ اس وقت یہ بات عام مشاہدے میں ہے کہ روایتی حجاب کی جگہ عام اسلامی لباس لے رہا ہے، مسیحی راک موسیقی کی طرز کی اسلامی موسیقی تخلیق کی جا رہی ہے اور دکانوں پر حلال فرائیڈ گوشت بھی دکھائی دینے لگا ہے۔ مذہبیت غیر نمائشی شکل اختیار کر کے گلوبلائزڈ عوامی کلچر کو اظہار کا ذریعہ بنا رہی ہے۔

پسِ اسلامیت کے یہ تینوں پہلو "فتح اور غلبۂ اسلام" کے تصور کی ہرگز وکالت نہیں کرتے۔ خالص سیاست سے مراد مذہب اور سیاست کا جدا ہونا ہے لہٰذا خالص سیاست اسلام آئزیشن نہیں بلکہ اس کی ضد ہے۔ خالص اسلام کی تلاش نئے سرے سے اسلامی رنگ چڑھانے[45] کی کاوش سہی لیکن سیاسی اجارہ داری اس منصوبے میں ہرگز شامل نہیں۔ ثقافتی اعتدال کاری مذہب سے زیادہ نقالی کے رجحانات کا نام ہے اور ان میں جدال و قتال اور توسیع پسندی کو کوئی دخل نہیں۔

---

[42] lobbying

[43] Indigènes de la République (French Republic's Indigenous Peoples),

[44] Lay off my pal

[45] re-Islamisation

اقلیتی محلے سے اجتماعی ہجرت تک

اخوان المسلمون کو مغرب میں مشکلات کا سامنا ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مغرب میں اس تحریک سے وابستہ لوگوں کی تعداد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں اخوان المسلمون کو بنیاد پرست تحریکوں کا سامنا ہے۔ بنیاد پرستی کے دھندلے جال میں جہادی کلچر کی بجائے وہابی تحریک کا فرقہ ورانہ جوش و خروش اور بے لچک عقیدہ پرستی زور پکڑ رہی ہے۔ وہابی فرقہ ان لوگوں کے پرکشش ہے جو اسلام پرستی یا کہنہ بنیاد پرستوں، مثال کے طور پر تبلیغی جماعت، سے مایوس ہو چکے ہیں۔

اخوان المسلمون کے برعکس وہابی فرقہ بڑے شہروں کے پس ماندہ مقامات اور برطانیہ کے مرکزی شہروں میں زیادہ متحرک دکھائی دیتا ہے۔ یہاں مغربی معاشروں سے قلع تعلقی کا درس دے کر یہ فرقہ اپنی الگ تھلگ حیثیت منوانے اور علیحدگی کے فروغ سے عائد شدہ صورتِ حال کو مذہبی چوائس میں بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم وہابی فرقہ، کئی وجوہات کی بنا پر، مغرب کو فتح کرنے کا نیا ہتھیار ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا ہے۔

اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ وہابیت ایک فرقہ ہے جو کثیر الثقافتی ماحول میں اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ وہابی مغربی معاشرے سے روگردانی کا درس دیتے ہیں۔ اس تعلیم کی بنیاد اس خوف پر ہے کہ کہیں وہابی اقدار میں ملاوٹ نہ ہو جائے۔ اس کا مقصد مذہب کی ایسی حالت کی جانب رجوع کرنا ہے جس کا اطلاق خاندان اور معاشرتی سطح پر ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے وہابی فرقہ جوشیلے نوجوانوں کے گروہ پر مشتمل دکھائی دیتا ہے جو اپنے آپ کو "نجات پانے والا فرقہ"[46] قرار دیتے ہیں۔

وہابی فرقہ حقیقی مسلمان معاشرے کا انکار کرتا ہے۔ یہ خاندانوں کو ناراض اور روایتی اماموں کو للکارتا ہے۔ یہ پرجوش اور غصیلے جوانوں کا اسلام ہے۔ ایسے لوگوں کا مذہب ہے جو اپنے ماحول سے کٹ چکے ہیں۔ نتیجے کے طور پر، یہ فرقہ مستحکم اور ہم آہنگ تُرک اور قمری[47] معاشروں میں اپنی جگہ بنانے میں بُری طرح ناکام رہا ہے۔ چونکہ وہابی فرقہ صرف اور صرف مذہب پر زور دیتا ہے، اس لئے اسے ثقافت، معاشرت اور سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں۔ سیاسی اجارہ داری کا سلفی نعرہ دراصل حالیہ اختراع ہے۔

وہابیت معاشرت اور سیاست کو نظر انداز کر کے صرف اور صرف مذہب پر زور دینے کا کڑوا پھل ہے۔ یہ فرقہ مغرب کے ساتھ تعلقات کی بنیاد نظریاتی استدلال پر رکھ کر گریز اور اجتناب کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ تاہم اس فرقے کے نزدیک اس کی اہم ترین کامیابی مغرب کو فتح کرنا یا اسلام پرست اقلیتی محلے پیدا کرنا نہیں بلکہ مغرب سے قطار اندر قطار باہر نکلنا ہے۔ "مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ مسلمان ممالک کی طرف ہجرت کریں"۔ تاہم ہجرت کے اس بے نظیر پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس فرقے کے پاس مالی وسائل کی کمی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

---

[46] "Group of survivors" (*firqa nâjiyya*). Salafism
[47] Comorians

جہاں تک مسلمانوں کے مغرب کے ساتھ رواسم کا تعلق ہے، مغرب سے رُخصتی کو معیارِ کمال قرار دینے سے جنم لینے والا ہجرت کا تصور گذشتہ نسلوں کی طرح مسلمانوں کی موجودہ نسل کو بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے موزوں وقت کے انتظار کا درس دے رہا ہے۔ گذشتہ نسل نے اپنی زندگیاں "وطن واپسی" کی دیومالا کے سحر میں گذاری دی تھیں تو نئی نسل اپنی موجودہ جنم بھومیوں کو چھوڑنا چاہتی ہے۔ وہابی سکارف کے مسئلے پر خاموش ہیں، ملک بدر کئے جانے والے سلفی اماموں کو واپس بلانے کے لئے کوئی تحریک نہیں چلا رہے اور فلسطین کے حق میں احتجاجی مظاہروں میں بھی دکھائی نہیں دیتے۔

منصوبے کے بغیر معاشرے کے خلاف
نوجہاد پسندوں کا انکارِ کُل

جہاد پرست عسکریت پسند (طالبان اور کا پلان تحریک) فرقہ وارانہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ اس طرح وہابی / سلفی فرقے اور جہاد پرستوں کے مابین فرقہ واریت مشترک قدر ہے۔ وہابی فرقے کی طرح یہ عسکری تحریکیں بھی اپنے مخالفین کو کافر قرار دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک نہ صرف دیگر تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ کافر ہیں بلکہ (ان کی ہاں میں ہاں نہ ملانے والے) مسلمانوں کو بھی مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔ واضح رہے کہ اس وقت اخوان المسلمون بھی وہابی / عسکری تحریکوں کی تکفیر کی زد میں ہیں۔

وہابی اور جہاد پسند گروہوں کا مقصد جزب اللہ اور حماس کی طرح مغرب میں "مزاحمتی معاشرہ"، اقلیتی محلہ یا متبادل ثقافت تشکیل دینا ہر گز نہیں بلکہ مغرب مخالف سیل (cell) تشکیل دینا ہے جو مغربی اور ایسے مسلمان معاشروں، جنہیں وہ عام طور پر جاہلیہ اور خدا کے قانون کے منکر کہتے ہیں، سے مکمل طور پر منہ پھیر چکے ہوں۔

آلیور رائے کے بقول وہابی اور جہادی انتہا پسندی کا آغاز معاشرے اور معاشرتی عمل سے خارج ہونے سے ہوتا ہے[48]۔ منافرت اور لعن ولعنت کو انتہا تک لے جانے کی وجہ سے آج کے جہاد پرست فرقوں کے پاس ایسا کوئی معاشرہ نہیں جس کی آزادی ان کی تگ ودو کا مقصد قرار پائے۔ ان کے پاس کوئی ریاست، علاقہ یا آبادی نہیں جہاں وہ کوئی سماجی تبدیلی لانا چاہتے ہوں۔ ان کا مقصد مزاحمت برائے مزاحمت، ابلاغِ عامہ کے ذرائع کو صدمات سے دوچار کرنا اور سیاسی سلطنت (مثال کے طور پر امریکی طاقت) کی ہر نشانی ملیامیٹ کرنا ہے۔

عصرِ حاضر کے جہاد پرستوں نے تشدد کو قربانی کا نام دیا ہے۔ اس دور کے عسکریت پسند کو مجاہد کی بجائے شہید کہا جاتا ہے۔ سابقہ دور کے جہاد پسندوں (لبنان میں حزب اللہ، فلسطین میں حماس اور کشمیر میں لشکر طیبہ) کے برعکس، جو کہ قومی علاقہ جات میں مصروفِ عمل تھے، عصری عسکریت پسند اپنے آپ کو "انصاف پسند" کہنے کی بجائے "پاک" کہتے ہیں۔ یہ "پاک" لوگ ان کے نزدیک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جو

[48] *Globalized Islam: The Search for a New Ummah* (New York, Columbia University Press, 2006

"ناپاک" اور تاریک دنیا ہے۔اس لئے وہابی جہاد پرست معاشرے تشکیل دینے سے متنفر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسلام پسند تحریک کار متفقہ طور پر انہیں رد کر چکے ہیں۔

نتیجتاً مسجد بہت کم انتہا پسندانہ اور تشدد پر مبنی واقعات کا سرچشمہ دکھائی دیتی ہے۔اس کے برعکس مسجد اور جہاد پرستوں کے مابین ایک بھروسے اور اعتماد کی خلیج دکھائی دیتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد نہ صرف ایک ایسا مقام جس کی نگرانی آسان ہے بلکہ اسے مغرب کے ساتھ مثبت مکالمے کا مقام ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے۔اس لئے مساجد کے قائدین اور امام سمجھوتے کی حکمتِ عملی پر یقین رکھتے ہیں۔

جین پیری فیلیو کے مطابق فرانس میں عراقی جہاد پسندوں کا نیٹ ورک[49] ختم کیا جا چکا ہے۔اس نیٹ ورک کے لیڈر کے انتہا پسند ہونے کی وجہ اسے سٹالن گراڈ مسجد سے نکالا جانا تھا۔11 مارچ 2004 کے میڈرڈ دھماکوں کی وجہ بننے والے نیٹ ورک کا قیام بھی کچھ ایسے ہی عمل میں آیا تھا۔اس گروہ کی قیادت نے بھی انتہا پسندانہ رجحانات میڈرڈ کی مسجد سے باہر اپنائے تھے کیونکہ مسجد کے امام اور نیٹ ورک کی قیادت کے درمیان کئی موقعوں پر باہمی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا چکا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سلامتی اور نظریاتی خطرات کے پیشِ نظر، انتہا پسند عناصر نیٹ ورکس کی تشکیل دینے کے لئے دیگر مقامات اور وسائل کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی جگہوں (مثال کے طور پر انٹرنیٹ کیفے، سپورٹس کلبس، مارشل آرٹس جِم، انٹرنیٹ، قید خانہ وغیرہ) کا انتخاب کرتے ہیں جو حکام کے وہم و گمان میں نہ ہوں۔ تاہم "لنڈنستان" کا قیام ایک استثنائی واقعہ ہے۔آلیور رائے کے مطابق بعض لوگ مسجد میں داخل ہونے سے قبل انتہا پسند بن چکے ہوتے ہیں۔ان کی انتہا پسندی مسجد تک ان کی رہنمائی کرتی ہے۔زاکاریاس موسوئی کا واقعہ آلیور رائے کی اس بات کی شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی عسکریت پسندی کے رجحانات، بہت حد تک، "فتح یا غلبہ ٔاسلام" کو اپنے مقصد کے طور پر ظاہر نہیں کرتے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے اسلامی تحریک کار اہم شخصیات بن کر ذوقِ تنازعہ اور شوقِ فساد کو ماضی میں دفن کر چکے ہیں۔ اب ان رجحانات پر نوبنیاد پرست سلفی ازم غالب آرہا ہے۔ نوبنیاد پرست وہابیت معاشروں کی تعمیر اور "مسلمان" معاشروں کو اسلامی قرار دینے کا انکار کرتی ہے۔ غیر معاشرتی وہابی نظریات کا نتیجہ اجتماعی ہجرت کے درس یا پھر سیاسی فنایت اور تہس نہس کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس فرقے نجات کے حصول کے لئے "شہادت" کے علاوہ ہر راستہ تکفیر کی دھند میں لپیٹ دیا ہے۔

[49] The Farid Benyettou network

سماجی زاویے

مغربی تہذیب کا غلبہ

کس نوعیت کے سماجی عوامل مسلم توسیع پسندی یا غلبے کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آبادی اور مذہبی رجحانات میں اضافہ۔ مسلمانوں کے زیر اثر مغرب اقلیتی محلہ جات ثانوی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں جن کی مدد سے توسیع پسندی اور غلبے کے امکانات کی جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے۔

مسلمان بچوں کی شرح پیدائش میں کمی

توسیع پسندی کے نظریے کا مرکزی نکتہ مسلمان بچوں کی شرحِ پیدائش سے متعلق ہے۔ اس دلیل کی بنیاد عورتوں میں بچے پیدا کرنے کی شرح اور آبادی میں غلبے کی نیت سے کیا جانے والا اضافہ ہے جس کی بنیاد پر اسلام کی غلبہ پرست فطرت سامنے آتی ہے۔ مذہبی کتب میں شرحِ پیدائش میں اضافے کا درس ملتا ہے۔ شرحِ پیدائش میں اضافے کا درس اسلامی ویب سائٹس پر اس وقت دیا جاتا ہے جب خانہ منصوبہ بندی یا مانع الحمل طریقہ کار کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ توسیع پسندی کی نیت سے آبادی میں اضافے کے تناظر میں دو نکات کا ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے:

- پاکستان اور نیم صحرائی افریقی ممالک کے علاوہ ہر مسلمان ملک میں شرحِ پیدائش میں واضح کمی دیکھنے میں آرہی ہے۔ ایمینوال ٹوڈ اور یوسف کاربیج[50] کی تحقیق کے مطابق مسلمان خواتین میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت میں واضح طور پر کمی واقع ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر 1975 کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمان خواتین میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت 6.8 سے کم ہو کر 2005 میں 3.7 ہوچکی ہے۔ مراکش میں تیس برس کے قلیل عرصے کے دوران بچے پیدا کرنے کی صلاحیت 7.3 سے کم ہو کر 2.4 بچے فی عورت ہوچکی ہے۔ الجیریا میں یہ شرح 8.4 سے کم ہو کر 2.6 تک پہنچ چکی ہے۔ سعودی عرب میں 8.5 سے کم ہو کر 3.6 تک آن پہنچی ہے۔ سیکولر ترکی اور اسلام پرست ایران میں، یکساں طور پر، 7.6 سے 2 تک کمی واقع ہوئی ہے۔ بچے پیدا کرنے کی صلاحیت میں کمی کے حوالے سے قبائلی معاشرے کچھ زیادہ لچکدار دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر لیبیا میں 7.6 سے 2.8 تک جبکہ اُردن میں یہ صلاحیت 8.6 سے کم ہو کر 3.6 بچے فی عورت ہوگئی ہے۔ شرحِ پیدائش کے سلسلے میں سامنے آنے والا "جدت" کا یہ رجحان عرب ممالک میں دیر سے پہنچا ہے۔ تاہم عرب دنیا میں بھی ان رجحانات کو بہت جلد قبول کرلیا گیا ہے۔
- آبادی اور بچے پیدا کرنے کی صلاحیت میں کمی کے علاوہ اسلام آئزیشن کے رجحانات میں بھی کمی دکھائی دیتی ہے۔ اسلامی ریاستوں (مثال کے طور پر ایران) کے مغربی آبادیاتی رجحانات کی حامل مسلمان آبادی پر اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس وقت جزیرہ نمائے عرب، جو اب بھی وہابی / سلفی پیدا کرنے کی نرسری تصور کیا جاتا ہے، خاندانی منصوبہ بندی اپنا چکا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی "سیاست" کے مضبوط قلعوں میں بھی خاندانی منصوبہ بندی کے رجحانات نے نہایت تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے۔ مثال کے طور پر

[50] *Le Rendezvous des civilisations* (Paris, Seuil, 2007),

ایران میں شرحِ پیدائش 1985 میں 6.3 تھی جو اس وقت 2.1 تک کم ہو چکی ہے۔ شرحِ پیدائش میں کمی کے اس رجحان کی وجہ شاہ کا وہ دور نہیں جب ایران کو جدید ریاست بنانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں بلکہ یہ رجحان قدامت پسندی کے ادوار میں بھی برقرار رہا ہے۔ کنبہ چھوٹا رکھنے کا رجحان 1985 میں اسلامی انقلاب کے دوران بھی قائم رہا ہے۔

- جہاں تک شیعہ لبنان اور فلسطین میں مزاحم معاشرتی نفسیات[51] کا تعلق ہے، یہ مزاحمتی نفسیات بھی، فلپ فراگوس کی اصطلاح میں، "جنگجو آبادی"[52] پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ حزب اللہ کا عسکری ماڈل بہت حد تک غیر متوازی اور اعلیٰ طبقات کے مفادات کی جنگ لڑ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حزب اللہ افرادی قوت کی کمی کا شکار رہا ہے۔ اس کے علاوہ فلسطینی انتفاضہ[53]، 1987 کی عسکری لہر کے برعکس، اسرائیل میں مسلمان آبادی میں اضافے کی وجہ نہیں بن پائی۔ مسیحی دنیا کے برعکس مسلمان دنیا میں اسلام پرست رجحانات میں کمی[54] کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلم دنیا میں ناخواندگی کے خاتمے پر بھی بہت کم زور دیا گیا ہے جس کی مدد سے جدت پسندی کے رجحانات پیدا ہو سکتے تھے۔ اسلام پرستی کے رجحانات میں اضافے کی وکالت کرنے والے عناصر انفرادی اقدار کے تابع دکھائی دیتے ہیں جبکہ شرحِ پیدائش میں اضافے کی حکمتِ عملی گروہی (قبائلی / معاشرتی) نفسیاتی عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی مسلم آبادی اپنے آپ کو موجودہ سطح پر مستحکم کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔ اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس آبادی میں امیگریشن کے ذریعے اضافہ دیکھنے میں آئے گا۔ چونکہ سوئٹزرلینڈ میں مسلم آبادی کی ایک بہت بڑی تعداد نوجوانوں پر مشتمل ہے، اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں مسلمانوں کے ہاں شرحِ پیدائش میں اضافہ دیکھنے میں آئے۔ تاہم آبادی میں اس ممکنہ اضافے کو اسلام کے فروغ سے تعبیر کرنا درست نہیں ہو گا۔

اسلام کی طرف واپسی اور اسلام قبول کرنے کا عمل

انفرادی پاکسازی

مسلمانوں میں شرحِ پیدائش کا کم ہونا مسلمانوں کے ہاں سماجی معمول کاری[55] کے رجحانات کی عام دلیل تصور کی جا رہی ہے۔ بالفاظِ دیگر مسلمان آبادیاں بہت تیزی سے مغربی جدت پسندی کا حصہ بن رہی ہیں۔ آبادیاتی جدت کے علاوہ سماجی معمول کاری شرحِ خواندگی میں اضافے، شہروں کی طرف ہجرت، طے شدہ اور قریبی رشتہ داروں کے ہاں شادیوں میں کمی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی لیبر مارکیٹ میں موجودگی بھی سماجی معمول کاری کی علامت سمجھی جا سکتی ہے۔

دنیا بھر میں اسلام اور دیگر مذہبی روایات سے تعلق رکھنے والوں کے ہاں "مذہبیت کی طرف واپسی" کا رجحان دکھائی دے رہا جس کی وجوہات انفرادی نوعیت کی ہیں اور اس مظہر کو کسی اجتماعی منصوبے کی پیداوار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بعض سکالرز کے نزدیک یہ رجحان معاشرتی استحکام

---

[51] جہاں عورتوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کا کہا جاتا ہے تا کہ یہ بچے جہاد میں حصہ لے سکیں *(muqâwim mujtam'a)*

[52] *Générations arabes, l'alchimie du nombre*, Paris, Fayard, 2000

[53] ۔عربی زبان کا لفظ جس کا لفظی مطلب "جھٹک کر گرانا" ہے۔ انگریزی زبان میں اسے بغاوت یا مزاحمت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

[54] de-Islamisation

[55] Social normalization

کی تلاش کے سفر کی عکاسی کرتا ہے۔ مذہب سے رجوع کرنے والے رضاکار گروپ ہیں جنہوں نے اپنی مرضی سے مذہب کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس میں کسی خاص معاشرے سے مذہبی وابستگی کا کوئی تعلق نہیں اور مذہب کی طرف واپسی افراد کا انفرادی فیصلہ ہے۔ اسلام آئزیشن کے راستے روایتی ساخت اور بنیادوں سے خارج دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے اسلام آئزیشن کا عمل اسلام پرستوں سے دامن بچائے بغیر ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ عصری مذہبی رجحانات غیر منظم بنیادوں پر قائم ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادی اور "اپنی مدد آپ" کے اصول پر قائم ہیں۔ کبھی کبھار مساجد میں جاکر یا پھر کتابوں کی مدد سے دعائیں اور عبادات سیکھی جارہی ہیں لیکن ان مذہبی اعمال سے از سرنو اسلام آئزیشن کی خواہش جنم نہیں لے رہی۔ عصری مذہبی لہر اخلاقی بنیادوں سے خالی ذاتی نوعیت کے فتوؤں، رنجشوں اور لین دین کا نام ہے۔

عصری مذہبی رجحانات کی نگرانی مذہبی رہنماؤں کی بجائے سماج کرتا ہے۔ نتیجتاً اماموں کی تعداد میں اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ 1995 میں فرانس کی مساجد اور عبادت گاہوں میں 800 امام تھے اور دس سال بعد ان کی تعداد 1000 کے قریب ہے۔ تاہم مذہبی انفرادیت گروہی اثر کا نتیجہ ہے۔ بریڈفورڈ انگلستان میں مسلمان ماحول کی وجہ سے سماجی عادات نے جنم لیا ہے اور لوگ ماہِ رمضان میں روزے رکھنے لگے ہیں۔

مذہبی ساختی ڈھانچوں (اسلامی کتب خانوں، انٹرنیٹ سائٹس اور عبادت گاہوں) کے عام ہونے سے اپنی مدد آپ کے اصول کے مطابق نئے سرے سے اسلام آئزیشن کا رجحان مغرب میں آنے والے مسلمان مہاجرین کی پہلی نوجوان نسل میں دکھائی دیتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اسلام کی جانب رجوع کرنے کے رجحانات کی دو وجوہات ہیں: ایک طرف مذہب کی ایسی شکل ہے جو ثقافت اور شناخت کی ضرورت سے جنم لے رہی ہے۔ گلیوں میں اسلامی لباس پہن کر چلنا، سر ڈھانپنا، حلال پاپ (فرانسیسی مشروبات کی کمپنی) اور مسلم اَپ پینا ثقافت اور شناخت کی ضرورت کا اظہار ہے۔ دوسری طرف بنیاد پرستی ہے جو مغربی معاشروں سے مکمل قطع تعلق کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ تاہم ان دونوں رجحانات کا مقصد غلبہ اور فتح ہرگز نہیں ہے۔ بنیاد پرستی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مغرب سے اجتماعی ہجرت کو اپنا آخری کارنامہ قرار دیتی ہے۔ اس کے برعکس ثقافتی معمول کاری کسی بھی متبادل تصور کو قبول نہیں کرتی اور اپنے آپ کو مغربی ثقافت کا ایسا جزو قرار دیتی ہے جس کی مدد سے عالمگیر مغربی معاشرہ روحانیت سے ہم آہنگ ہو کر تکمیل پا سکتا ہے۔ جہاں تک دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تعداد کا تعلق ہے، یہ تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔ فرانس وزارتِ داخلہ کے محتاط اندازے کے مطابق ہر روز 12 کے قریب لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس وقت فرانس میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد 50,000 سے زیادہ ہے۔ اسلام کے برعکس دوسرے مذاہب قبول کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ فرانس میں ہر سال 800 سے زائد مسلمان مسیحیت قبول کر چکے ہیں جبکہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد 4000 کے لگ بھگ ہے۔ تاہم سوئٹزرلینڈ میں مذہب تبدیل کرنے والوں کے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔

عسکری تنظیمیں مذہب تبدیل کرنے پر زور دیتی ہیں۔ تاہم ایسی تنظیمیں نو معتقد افراد کو اپنے داخلی حلقوں کا حصہ نہیں بناتے۔ اس لئے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے والوں کی سیاسی و عسکری کامیابیوں کی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہابیت واحد فرقہ ہے جس میں جہادی اور انتہا پسندانہ خیالات رکھنے کے انعام کے طور پر اعلیٰ قیادت کے راستے کھول دیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانس میں 23٪ لوگ

وہابیت قبول کر کے عسکری تنظیموں کا حصہ بن چکے ہیں[56]۔ دراصل وہابیت واحد تحریک ہے جو نہ کسی خاص خطے کی قیدی ہے اور دیگر ثقافتوں میں رچ بس چکی ہے۔ وہابی فرقے نے اپنے آپ کو مشرقِ وسطیٰ میں مغربی عسکری قوتوں سے الگ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس فرقے نے مذہبی املاک کو نسلی پہلوؤں سے الگ کرتے ہوئے ان لوگوں کی مدد کی ہے جو پیدائشی طور پر مغربی نہیں تھے یا پھر غیر عرب معاشروں سے تعلق رکھتے تھے۔

معاشرتی تعمیر کے بغیر الگ تھلگ رہنا

اقلیتی محلہ کیا ہے؟ مسلمانوں کو الگ تھلگ رکھنے کی روایت ایک حقیقت ہے۔ لیکن محلہ نہ فتح کا منبر ہے اور نہ کوئی ایسا راستہ ہے جس کے ذریعے اسلام مغرب کے قلعے میں داخل ہو کر اسے فتح کر لے گا۔

اگرچہ سماجی کنٹرول کے کچھ عناصر موجود ہیں مگر پھر بھی مسلمان آبادی کا تشخص اسلامی عسکریت پسندی کے تناظر میں، جو مغرب سے مکمل طور پر قطع تعلقی کا درس دیتی ہے، بہت حد تک مبالغے پر مبنی ہے۔

مغرب میں مسلم اقلیتی محلہ کسی طرح بھی سماجی تعمیر کی سیاسی حکمتِ عملی کا حصہ نہیں ہے۔ یہ پیچیدہ سماجی، معاشی اور سیاسی عوامل کا نتیجہ ہے۔ یہ ایسے حکومتی رویوں کا بھی نتیجہ ہے جو نہ صرف ایسے ممالک (ہالینڈ اور برطانیہ) جہاں سماجی تعمیر کے تصورات کا احترام کیا جاتا ہے بلکہ فرانس میں بھی منظر عام پر آتے ہیں۔ کوئی ملک بعض معاملات میں جتنا بھی سیکولر کیوں نہ ہو، مذہبی قیادت انتخابی نظام میں پیش پیش دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ ملکی سیاست کا حصہ بننے کے بعد ہاؤسنگ کے منصوبے نسلی بنیادوں پر مرتب کرتے ہیں اور معاشرتی تعمیر کے نام پر آرام دہ ملحقہ علاقوں[57] کے لئے ثالث یا وچولی تلاش کر لیتے ہیں۔

اسلام (یا اسلام پرستوں) اور مسلمانوں کے لئے مختص شدہ الگ مقامات کے مسئلے پر کچھ نکات قابلِ غور ہیں:

اولاً سیاسی اسلام درمیانے طبقے پر مرکوز ہے لیکن اس کا پیمانہ اعلیٰ طبقات ہیں۔ ان طبقات کا آرام دہ ملحقہ علاقوں پر کوئی قبضہ نہیں۔ یہ مسئلہ اس وقت کھل کر سامنے آیا جب 2005 میں فرانس فسادات کی زد میں اور مسلمانوں کو فساد سے الگ رکھنے کا فتویٰ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ واضح رہے کہ یہ فتویٰ فرانسیسی اسلامی تنظیموں کی یونین نے دیا تھا اور مرکزی تنظیم کا تعلق اخوان المسلمون سے تھا۔ اس وقت مغرب میں سیاسی اور تبلیغی نوعیت کی اسلامی تحریکیں موجود ہیں۔ لیکن یہ تحریکیں بے اختیاری کی حد تک کمزور ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ عناصر فرانسیسی پر فضا مقامات کے سماجی نظم و نسق کا حصہ ہیں لیکن یہ لوگ بھی اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

---

[56] *Le Monde*, 12 July 2005
[57] *banlieues*

جہاں تک سلفیوں کا تعلق ہے، یہ لوگ سماجی تعمیر کے میدان میں پیش پیش اور اپنے مسلک سے متعلق افراد کے درمیان تعلقات بہتر کرنے کے لئے سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش دیگر طبقات کا گھیراؤ کم کرنے کے لئے حکمتِ عملیاں مرتب کرتے ہیں اور شہروں سے ملحقہ پر فضا مقامات میں بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ ان مقامات پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی تعداد کا کم ہونا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سلفیوں کے ہاں سیاسی و سماجی تنظیم سازی کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، سلفی مغرب میں اسلام پرست طبقات یا معاشروں کے قیام کی بجائے اسلامی سرزمینوں کی طرف اجتماعی ہجرت کا درس دیتے ہیں۔ اس لئے مغرب کے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے صارفی ثقافت اور منڈی پر مبنی معاشرت کا رجحان مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا ہے۔ ٹوڈ لکھتا ہے کہ سماجی یکجہتی کا وہ ماڈل جو کبھی شمالی افریقہ میں دکھائی دیتا تھا رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔ مرد اور عورتیں اپنے دیگر معاشروں کی عورتوں اور مردوں کو اپنا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر الجیریا کی خواتین میں دیگر معاشروں میں شادی کرنے کے رجحان میں 1970 سے 1990 کے درمیان 6.2٪ سے 27.5٪ تک اضافہ ہو چکا ہے۔ مراکش کی خواتین میں یہ شرح 4٪ سے بڑھ کر 13٪ ہو چکی ہے۔

منظم ہونے کی راہ میں دشواری، خاندانی جڑت کی کمی اور مسلمانوں سکولوں کی کمزوریاں بھی اس سب کی وجہ ہو سکتی ہیں۔ چند دیگر قوانین کے ساتھ ساتھ 2004 کا قانون مذہبی علامات پر بات کرتا ہے اور فرانسیسی مسلمانوں کے ہاں شخصی نظم و ضبط کی مذمت نہیں کرتا۔ مسلمان یہودیوں اور مسیحیوں کی نسبت کم درجے کی معاشرتی ذہنیت کے مالک واقع ہوئے ہیں۔ جب فرانس کے 256 مذہبی سکولوں میں 30,000 سے زائد یہودی بچے زیرِ تعلیم ہیں اور شاندار ثانوی مسیحی سکول بھی موجود ہیں (20,000 سے زائد بچوں کو سیٹیں نہ ہونے کی وجہ سے داخلہ نہیں دیا گیا) اس کے بر عکس مسلمانوں کے دو سکولوں میں محض ایک سو یا اس سے زیادہ بچوں نے داخلہ لیا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ووٹ کا تعلق ہے، مسلم ووٹرز نہ صرف غیر موثر بلکہ نایاب بھی ہے۔ مغرب میں مسلمانوں کے کمیونٹی لیڈر مساجد کے تعاون کے باوجود بُری طرح ناکام ہونے کی کہنہ روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس صورتِ حال کو بدلا جا سکے لیکن اسلامی اقدار پر قائم سماجی کنٹرول کی موجودگی میں تا حال مغرب میں مسلمان محلے خارجیت اور تنہائی کا شکار ہیں۔

اس سب میں مسجد کہاں ہے؟

اسلامی توسیع پسندی کا تصور چار عوامل کا ملغوبہ کہا جا سکتا ہے: آبادی، مذہبی ذہنیت، محلہ اور سیاسی ارادہ۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا سیاسی ارادہ محلے کو نشانہ بنا کر سیاست اور مذہب کی جداگانہ نوعیت کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس بنیادی ناکامی کی وجہ سے "اسلامی نظریہ" جنم لے کر آبادی میں اضافے کو غلبے کا راستہ قرار دیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے ہی بات کر چکے ہیں، اس مظہر کا محرک بہت سے پیچیدہ عوامل ہیں۔ الگ تھلگ اقلیتی محلہ اگرچہ حقیقت ہے لیکن یہ ایک عائد کردہ حقیقت ہے منتخب کردہ نہیں۔ داخلی سطح پر دیکھا جائے تو مسلمانوں کی الگ تھلگ آبادیوں میں منتشر ہونے کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔

دوسری طرف تیزی سے فروغ پانے والی مذہبی ذہنیت (مذہبیت) انفرادی نوعیت کی ہے۔

مسجد اگرچہ بنیاد پرست پیدا کرتی ہے لیکن الگ تھلگ محلہ سازی اور انتہا پسندی دونوں سے برعکس اور مخالف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد مکالمے کا عمل، اجازت ناموں کے حصول اور مخالفت کی انتظام کاری کا نام ہے۔ اس کے علاوہ مساجد رابطہ سازی، منصوبہ بندی، سیاسی ماحول، ٹاؤن ہال اور انتظامی حکام سے میل جول میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

مساجد سے وابستہ لوگوں کی تعداد انہیں سیاسی طور پر ترغیب دہ مقام بناتی ہے۔ سیاسی طور پر متحرک لوگ مذہب سے وابستہ لوگوں کو انتخابی خزانے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر میئر کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ اگر وہ کسی کمیونٹی کو بد اندیش کر دیتا ہے تو وہ ان کے ووٹ سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ مساجد مختلف امیدواروں سے مکالمے اور سیاسی لین دین کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں۔

مساجد کو سیاسی مکالمے کی جگہ کے طور پر استعمال کرنے سے مذہبی قائدین اہم شخصیات تصور ہونے لگتی ہیں۔ فرانسیسی وزارتِ داخلہ میں مذہبی امور کے شعبے کے مشیر برنارڈ گوڈارڈ کے نزدیک فرانسیسی حکومت مساجد کی انتظام کاری اور نگرانی کے سلسلے میں پُر اعتماد دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ مساجد کا حقیقی مسائل (انتہا پسندی اور یاسیت) سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برعکس مساجد تشدد کی روک تھام اور ان کی شدت کو محدود تر کرنے کی جگہ ہے۔ انتہا پسندی مسجد سے تعلق جوڑنے سے نہیں بلکہ تعلق توڑنے سے جنم لیتی ہے۔ بینیتو نیٹ ورک اور میڈرڈ میں ہونے والے بم دھماکوں جیسے واقعات مندرجہ بالا مشاہدات کو تقویت فراہم کرتے ہیں۔

مساجد سماجی کنٹرول اور سماج کی سطح پر مرکزی شخصیات جنم دیتی ہیں۔ مغرب میں مساجد چلانے والے اوّلین مہاجرین ہیں جو 1990 کی دہائی تک احتیاطی حکمتِ عملی کے قائل رہے اور اس کے بعد مقامی ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک مساجد کا مطلب "مذاکرات" اور گردوپیش سے تعلق استوار کرنا ہے۔ تاہم وہابی فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے ماحول سے ربط پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہابی مساجد کا مقصد گردوپیش سے بے خبر ہو کر نمازیوں کو خطبات تک محدود رکھنا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی کا مسئلہ یورپ میں اسلام کے مستقبل جیسے اہم اور بنیادی سوالات جنم دے رہا ہے۔ اس سوال پر غور کرنے سے یہ مسئلہ محض نظریات اور عبادات کا مسئلہ دکھائی نہیں دیتا۔ مسئلے کو عبادات اور نظریات تک محدود رکھنا سماجی اور سیاسی آنکھ بند کرنے کے مترادف ہے۔ مینار رہیں نہ رہیں حقیقی طور پر حل طلب مسائل باقی رہیں گے۔

انتانیو ہوجرز

اسلام پر بنیاد پرستانہ تنقید بھی خطرناک ہے

سٹیفن لاثائن

انتانیو ہوجرز ارجنٹینی نژاد سوئس شہری اور 2007 سے پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ وہ جینوا گرین پارٹی کے صدر رہے ہیں اور عہدِ شباب سے سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ کئی تحریکوں کا حصہ ہے اور مہاجرین کی ہم آہنگی کے مسائل پر سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ میونسپل سطح پر غیر ملکیوں کے سیاسی حقوق کے فروغ کے لئے بھی کام کر رہے ہیں۔

ان کے سیاسی رجحانات کا دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے ٹکراؤ ناگریز تھا۔ اس وقت وہ SVP/UDC کے ساتھ امیگریشن اور تنوع کے مسئلے پر سیاسی مباحث میں مصروف ہیں۔ 2008 کے دوران، جب دائیں بازو کی ان جماعتوں نے ایسے غیر ملکیوں کو ملک بدر کرنے کا بل پیش کیا جو سوئٹزرلینڈ کی معاشرتی اور جمہوری روایات کا حصہ بننے سے انکار کر رہے تھے، اس وقت انتانیو ہوجرز نے سماجی و سیاسی تنوع (diversity) کے موضوع پر ایک نئی بحث کا آغاز کیا۔ انہوں نے غیر ملکیوں کی ملک بدری کا بل پیش کرنے والوں کو "ہم آہنگی کے بنیاد پرست" قرار دیا اور مزید میناروں کی تعمیر پر پابندی کی بات کی۔

وہ جینوا کے ایک جریدے میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میناروں پر پابندی عائد کرنے کا اقدام مسلم بنیاد پرستی کا جواب بنیاد پرستی سے دینے کے مترادف ہے۔ ان کے نزدیک یہ اقدام اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ انسانی تہاذیب ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے درمیان جنگ ناگزیر ہے۔ انتانیو ہوجرز کے نزدیک میناروں پر پابندی کی حمایت کرنا اس تہذیبی غلط فہمی کو اپنانا ہے جس کا شکار ہو کر مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ وہ روئے زمین پر کسی دوسرے کو قبول نہیں کر سکتے۔

ہوجرز کے نزدیک مینار کو محض ایک ہتھیار یا بہانے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جبکہ اصل مسئلہ اسلام ہے۔ اسلام ہوجرز کے نزدیک ایسا مسئلہ ہے جسے شور مچا کر دبایا جا رہا ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان فرق پر زور دیتے ہیں۔ اسلام کسی ثقافت کے توسط سے منتقل ہوتا ہے جبکہ کسی ثقافت کا مذہبی ہونا لازم نہیں۔ یہاں پر وہ بالکانی مسلمانوں کی مثال دیتے ہیں جو، ان کے نزدیک، تمام ثقافتوں سے ماورا سیکولر اور پدرسری "ثقافت" ہے۔ "کوسووہ کا پہلا جشنِ آزادی ملاحظہ فرمائیں، ٹاٹو اسلام کے ایک پہلو کی عکاسی کرتا ہے"۔ واضح رہے کہ ہوجرز کو جشنِ آزادی کی تقریبات میں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا جہاں ثور کا گوشت اور شراب وافر مقدار میں موجود تھی۔

ان کے نزدیک مسئلہ مذہبی رسومات بجالانے کا نہیں بلکہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کا ہے۔ مسئلہ اس منفی تشخص کا ہے جس کا سامنا ہر نوجوان مسلمان کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ روزگار کے مواقع اور ہاؤسنگ کی سکیموں تک رسائی کا مسئلہ ہے۔ یہاں پر وہ مثال پیش کرتے ہیں کہ روایت پسند سکھوں سعودی امرا کو سرے سے مسئلہ ہی نہیں گردانا جاتا– کیونکہ ان کے پاس پیسہ ہے اور سوئٹزرلینڈ میں جونہی آپ کے پاس دولت آجائے، آپ مسئلہ نہیں رہتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان تارکین بھی دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی طرح ہیں۔ تاہم یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کی دوسری نسل سوئٹزرلینڈ کی جدید سماجی اور جمہوری روایات کو اپنا پائے گی؟ کیا چند برس میں ان کے سماجی ارتقأ کے اشارے ملنا شروع ہو جائیں گے؟

ہوجرز یہ سوالات نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک انتہا پسندی ایک بہت بڑا خطرہ ہے اور اس کے امکانات سے انکار بھی ممکن نہیں۔ تاہم وہ اس بات حیران دکھائی دیتے ہیں کہ میناروں پر پابندی کا اقدام (انتہا پسندی کی روک تھام میں) کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟ ان کے خیال میں یہ اقدام مساجد کی نشاندہی کر کے ایک بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے کیونکہ انتہا پسند اب مساجد میں پیدا نہیں کئے جاتے۔ اس کے علاوہ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو ذلت کا شکار کر کے انہیں انتہا پسندانہ رویوں اور اقدامات پر اکسایا جا رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل، ہوجرز کے خیال میں، ''انتہا پسندی کے مسئلے کا تخلیقی جواب، شناختی تزئین اور ہم آہنگی کی حوصلہ افزائی تو ہو سکتا ہے کسی طبقے پر کلنک کا ٹیکہ لگانا ہرگز نہیں''۔

ہوجرز کے نزدیک اس نکتہ نظر سے میناروں پر پابندی کا اقدام خطرناک دکھائی دیتا ہے۔ ہوجرز کہتے ہیں کہ اگر یہ اقدام کامیاب ہو جاتا ہے تو مسلمان اپنے آپ میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔

میناروں پر پابندی اور وفاقی آئین

اقدام کی تاریخ، مقصد اور مواد

اروین ٹائنر

10 اپریل 2007: مرکزی جمہوری یونین اور وفاقی جمہوری کے 16 افراد پر مشتمل ایک کمیٹی نے وفاقی چانسلری کو دستخطوں کی ایک فہرست پیش کرتے ہوئے آئین کے آٹیکل 72 پر نظر ثانی کرنے کو کہا۔ کمیٹی کا مطالبہ تھا کہ متذکرہ آرٹیکل میں تیسرا پیراگراف شامل کیا جائے کہ "میناروں کی تعمیر پر پابندی عائد ہے"۔ اپنی ویب سائٹ[58] پر کمیٹی نے اس اقدام کے جواز کے طور پر لکھا:

I. ایک مینار مسلمانوں کی اس خواہش کا علامتی اظہار ہو سکتا ہے کہ ریاست کا جمہوری / آئینی ڈھانچہ بدل کر معاشرتی نظم ونسق کو یکسر تبدیل کر دیا جائے۔
II. میناروں کی موجودگی سوئٹزرلینڈ میں مذہبی آزادی کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔

17 اپریل کے روز وفاقی چانسلری نے فیصلہ کیا کہ دستخطوں کی فہرست آئینی تقاضے پورے کرتی ہے۔ آئینی صحت کے پیش نظر اسے وفاقی جریدے[59] میں بھی شائع کر دیا گیا۔ اقداماتی کمیٹی نومبر 2008 تک 100,000 سے زائد دستخط حاصل کر چکی تھی۔
8 جولائی 2008 کو کمیٹی نے تمام دستخط وفاقی چانسلری کو پیش کئے۔ 28 جولائی 2008 کو اقدام کی کامیابی کا علم ہوا۔ اقدام کی کامیابی کے لئے درکار تمام دستخط حاصل کئے جا چکے تھے۔ یہ فیصلہ 19 اگست کے روز وفاقی جریدے[60] میں شائع کیا گیا۔ پیش کردہ دستخطوں کی تعداد 114,137 تھی جن میں سے 113,540 قبول کر لئے گئے۔ اس کے بعد وفاقی کونسل نے وفاقی اسمبلی کو ایک پیغام اور ایک سال کی مدت کے اندر ایک حکم نامہ جاری کرنا تھا۔ 27 اگست 2008 کو وفاقی کونسل میناروں کی تعمیر کے خلاف اپنا پیغام ارسال کیا[61]۔ اب بال وفاقی اسمبلی کے کورٹ میں تھی کہ وہ میناروں پر پابندی کے اقدام کی توثیق کرنے کے لئے اس بات کا فیصلہ کرے کہ اقدام میں صوری اور معنوی ہم آہنگی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے اور کہیں یہ اقدام بین الاقوامی قانون سے متصادم تو نہیں اور حکومت موجودہ وسائل کے اندر رہتے ہوئے اس پر عمل درآمد بھی کر سکتی ہے یا نہیں۔

وفاقی اسمبلی کو کہا گیا تھا کہ وہ (8 جولائی 2008 سے) ڈھائی برس کے اندر فیصلہ سنائے۔ اس طرح یہ فیصلہ 8 جنوری 2011 تک ہونا تھا۔ اگر اسمبلی اقدام پر ووٹنگ کا فیصلہ کرتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اقدام کو جائز تسلیم کر لیا گیا ہے۔

---
[58] www.minarette.ch
[59] FF 2007 3045 ss
[60] FF 2008 6259 sec
[61] FF 2008 6923 ss

12جون 2009 کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں بحث مکمل ہو چکی تھی۔4مارچ اور12 جون 2009 قومی کونسل میں اقدام کو زیرِ بحث لایا گیا اور 5اور12جون2009 میں کونسل آف سٹیٹ میں۔ وفاقی اسمبلی نے اقدام کو جائز قرار دیتے ہوئے شہریوں اور کنٹونز کو ووٹنگ کے عمل میں شامل ہونے کو کہا۔ تاہم وفاقی کونسل نے تجویز کیا کہ اقدام کو رد کر دیا جائے[62]۔

اس کے بعد وفاقی اسمبلی نے دونوں ایوانوں میں حتمی فیصلے کے بعد اقدام کے لئے ڈیڈ لائن کے بعد دس ماہ کے اندر ووٹ دینا تھا۔ یہ وہ میعاد ہے جو سوئس آئین کسی بھی مسئلے پر غور کرنے کے لئے وفاقی کونسل کو دیتا ہے۔ اس طرح اس ووٹ 29نومبر 2009 کے روز کاسٹ کیا گیا۔

غیر روایتی اصول کا تعارف

شہری اقدام اس بات پر زور دیتا ہے کہ سوئٹزر لینڈ کا آئین مسلمانوں کا مینار تعمیر کرنا ممنوع قرار دے۔ یہ ایک غیر روایتی اور آئینی لحاظ سے ایک غیر معمولی اقدام تھا۔ اگرچہ اس اقدام کا اثر تھوڑی سی آبادی اور خاص قسم کی عمارتوں پر ہوناتھا لیکن اقدام کی منظوری سے آئین کے آرٹیکل 75 پیراگراف 1 کی نوعیت مذہبی ہو جاتی تھی جو محض دیہی اور شہری منصوبہ بندی سے متعلق تھا۔

آرٹیکل 72 میں ترمیم کا مسئلہ

میناروں پر پابندی کو وفاقی آئین کے آرٹیکل 72 کے تیسرے پیراگراف میں شامل کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے کنفیڈریشن کے اختیارات اور وفاقی ضلع کے اندر مذہبی طبقات اور ریاستی اداروں کے مابین تعلقات کی وضاحت کرنے والے پیراگراف میں شامل کیا گیا ہے۔

آرٹیکل 72: مذہب اور ریاست

I. مذہب اور ریاست کے مابین تعلقات کو معمول پر رکھنا وفاقی ضلع کی ذمہ داری ہے۔
II. اپنی صلاحیت کے مطابق کنفیڈریشن اور وفاقی اضلاع مختلف مذہبی طبقات کے مابین امن قائم رکھنے کے لئے مناسب اقدامات اٹھا سکتے ہیں۔
III. میناروں کی تعمیر ممنوع ہے (ترمیم شدہ)

اگرچہ آئین کے آرٹیکل 72 کو "مذہب اور ریاست"[63] کہا جاتا ہے لیکن یہاں مذہب (Church) سے مراد کوئی خاص مذہب نہیں بلکہ تمام مذاہب اور مذہبی طبقات ہیں۔ تاہم یہ آرٹیکل ہر اس چیز یا مظہر کا احاطہ نہیں کرتا ہے جو مذہب یا چرچ کے دائرے میں آتی ہے۔ متذکرہ آرٹیکل مذہب کو محض ایک ادارے کے طور پر دیکھتا ہے۔ آرٹیکل مذہب کی صوری (formal) اور عملی صورت کو دیکھتا اور اس میں دل چسپی لیتا ہے۔

---

[62] FF 2009 3903
[63] Church and State

اس کے علاوہ متذکرہ آرٹیکل یہ دیکھتا ہے کہ ریاست، جس میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ اور طبقات رہ رہے ہیں، کے اندر باہمی بقا کو کس طرح یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

آرٹیکل 72 کا اطلاق ایک طرف مذہبی طبقات (کمیونٹیز) پر ہوتا ہے تو دوسری طرف ان طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد پر۔ اس کا مقصد شہریوں کو ایک عالمی نصب العین فراہم کرنا اور ظاہری اختلافات سے ماورا کرنا ہے۔ دوسری طرف افراد کے کردار، خیالات اور اعمال کو ریاستی اقدار اور اصولوں سے ہم آہنگ کرنا ہے تاکہ وہ ایک مذہبی طبقے کا حصہ ہوتے ہوئے باہمی احترام کے اصول کا اپنی اجتماعی زندگیوں میں کا اظہار ممکن بنا سکیں۔

یہ آرٹیکل وفاقی اضلاع اور کنفیڈریشن کے مابین اختیارات کی تقسیم یقینی بناتا ہے (جو کہ آرٹیکل 3 اور 42 کے پہلے پیراگراف میں درج ہیں) اور ان کا اطلاق ریاست اور مذہب کے مابین تعلقات کو متعین کرنے والے آئینی ڈھانچے پر کرتا ہے۔

اس آرٹیکل کا دوسرا پیراگراف ریاست اوراُن مذہبی طبقات کے مابین آئینی تعلقات کی وضاحت نہیں کرتا جو ریاستی امن کے لئے خطرے کا باعث بن جائیں بلکہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ریاست مختلف مذہبی طبقات کے مابین تعلقات کو بہتر بنائے تاکہ ریاست کے اندر مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ پُرامن رہیں اور بقائے باہمی کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زندگی بسر کر سکیں۔

اس نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو آرٹیکل 72 پیراگراف 2 آرٹیکل 57 سے متعلقہ اہم اصول فراہم کرتا ہے جس کی مدد سے داخلی سلامتی کو ممکن بنایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آرٹیکل مذہبی آزادیوں کا احترام کرتے ہوئے ریاست کی مذہبی ذمہ داریوں کی حدبندی بھی کرتا ہے تاکہ ریاست مذہبی آزادیوں پر قدغن نہ لگا سکے۔ بالفاظِ دیگر یہ آرٹیکل غیر منحصر معیار بندی سے متعلق (normative) ہر گز نہیں ہے۔ یہ محض بیان شدہ قانونی میعارات کو ٹھوس شکل دے کر آرٹیکل 36 پیراگراف 2 (مذہب اور ریاست) بنیادی حقوق کی وضاحت کرتا ہے۔

آرٹیکل 72 میں میناروں پر پابندی کی شق شامل کرنے سے آئینی پس منظر اور ربط متاثر ہوتا ہے۔ تعمیرات پر خصوصی پابندی وفاقی آئین کا حصہ بنائی جاتی ہے اور اسے کنفیڈریشن اور کانٹونز کے اختیارات کی وضاحت کے ذریعے ریاست اور مذہب، مذہب اور ریاست کے مابین تعلق اور اختیارات کی وضاحت کرتے ہوئے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو باہمی تعلقات قائم رکھنے اور خود طے کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی فرد اپنی انفرادی ذمہ داریاں ریاستی فرائض کے تناظر میں تلاش کر سکتا ہے۔

بنیادی انسانی حقوق اور شہری اقدام

کیا میناروں کو آئین اور بین الاقوامی قانون سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ بنیادی انسانی حقوق کی پامالی اور انکار کے مترادف ہے، کیا یہ ان بین الاقوامی معاہدوں (جن میں یورپین کنونشن برائے انسانی حقوق اور کئی دیگر بین الاقوامی معاہدے شامل ہیں) کی خلاف ورزی کے مترادف ہے

جس پر سوئٹزر لینڈ (بطور ریاست) دستخط کر چکا ہے؟ کیا یہ سوئٹزر لینڈ کے آئین کی خلاف ورزی ہے جو مذہبی آزادیوں کی ضمانت فراہم کرتا ہے؟ مثال کے طور پر مذہبی آزادی 15 (ریاست اور مذہب)، جائیداد کا حق 26 (ریاست اور مذہب)، برابری کے سلوک کا حق (2 اور 8 پیراگراف 1 مذہب اور ریاست)۔

آئین میں دیے گئے اختیارات کی روشنی میں میناروں پر پابندی کا جواز پیش کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ آئین ان حقوق کے تحفظ کی بھی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ یہ پابندی ایک مخصوص گروہ کے اراکین پر لگائی گئی ہے کہ وہ آئین کی فراہم کردہ مذہبی آزادیوں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتے اور خاص صورتِ حال کے پیشِ نظر جائیداد کے حق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ یہ اقدام (مسلمانوں کو) ان حقوق کے کھلے عام "تعمیراتی اظہار" سے روکتے ہوئے معاشرے میں متعلقہ افراد کی اہمیت کو کم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اقدام متعلقہ افراد اور اداروں کو شہری اور دیہی سطح پر نمایاں ہونے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ یہ پابندی مخصوص مذہبی ادارے پر تعصب کا ٹیکہ لگا کر متعلقہ افراد کی زندگیوں اور مذہبی و ثقافتی شناختوں کو تعصب کی "روشنی" میں دیکھتا ہے۔

دفاع اور مفادِ عامہ کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو میناروں پر پابندی کو کسی بھی صورت میں مناسب اور ضروری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ پابندی ان لوگوں کے لئے بالکل مناسب نہیں جو اس سے متاثر ہوسکتے ہیں۔ (تناسب کا اصول)

- یہ اقدام جس پابندی کی سفارش کرتا ہے اسے عدم برداشت کا اظہار کہا جاسکتا ہے جس سے سوئٹزر لینڈ کے مسلمانوں میں بے چینی جنم لے گی جس سے دیگر آبادیوں کا چین اور سکون بھی متاثر ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اقدام مسلمان ممالک میں احتجاجی مظاہروں کا باعث بنے گا۔ اس طرح اقدام کے نتائج متوقع نتائج سے برعکس ہونگے۔ کیونکہ یہ اقدام وسیع تر بے چینی کا باعث ہوگا۔
- میناروں پر پابندی عائد کرنا از خود انتہا پسندانہ اقدام ہے۔ اس میں حدود اور توقعات کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ مسلمانوں کے سامنے ایک ریاستی ضرورت پیش کرنے کی وکالت کرتا ہے۔ اس سے بنیادی ریاستی قضیے (یا اصول) کو زد پہنچتی ہے کہ " ریاست ان تقابلی (competing) مفادات میں ہم آہنگی لائے جن کے تحفظ کی آئین ضمانت دیتا ہے "۔ سوئٹزر لینڈ ایک جمہوری ریاست ہے جہاں قانونی اقدامات وضع کئے گئے ہیں اور ہر قانونی حکم نامہ اداراتی مراحل سے جنم لیتا ہے۔ ریاست، ایک آزاد اور جمہوری باڈی ہونے کے ناطے، مسلمانوں سے بہتری کا تقاضا کرسکتی ہے تاکہ ریاست معاشرے میں تناؤ اور تنازعات کی مزاحمت کے قابل ہوسکے۔ نسلِ انسانی اور انسانی گروہوں کی باہمی بقا اور پرامن رہن سہن کو یقینی بنانا۔ ایک جمہوری ریاست ہونے کے ناطے سوئٹزر لینڈ نے بدنظمی کے خدشات کی صورت میں آئین کی پاسداری کرتے ہوئے حقوق اور آزادیوں کا تحفظ کرنا ہے جن کی آئین ضمانت دیتا ہے۔ مطلوبہ نتائج معتدل اقدامات سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر (میناروں پر یکسر پابندی لگانے کی بجائے) معاملے کو کیس در کیس تعمیراتی اجازت ناموں کے پس منظر میں دیکھا جائے اور ہر تعمیراتی اجازت نامے کو شرائط، ذمہ داریوں اور ماحول کے مطابق بنایا جائے۔ یہ جائیداد کی رجسٹریشن کے تناظر میں عوامی قانون کو محدود

کرنے سے ممکن بنایا جاسکتا ہے کیونکہ موجودہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مینار تعمیر کرنے کی اجازت اس صورت میں دی جائے جب اس کا سائز، شکل اور حجم موجودہ قانون کے عین مطابق ہوں اور ایسا تعمیراتی انداز مرتب کیا جائے جو تعمیراتی ناقدین کے نزدیک بھی قابلِ قبول ہو۔ میناروں کے لئے ایسا رنگ اور تعمیراتی مواد استعمال کیا جائے جو تعمیراتی مقام سے ہم آہنگ ہو اور مینار تک رسائی صرف مرمت کے وقت ممکن ہو۔ اس کے علاوہ مینار کے لئے موذوں اور پروقار روشنی کا اہتمام کیا جائے۔

- یہ اقدام انتہائی غیر لچکدار ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کو کسی بھی قسم کی تعمیر کے لئے مینار ضروری بھی ہو تو اس کی تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ میناروں کی تعمیر کی یکسر نفی کرتا ہے اور اس کے فائدے اور نقصانات جاننے کے لئے قدر پیمائی اور غور و فکر کی بھی اجازت نہیں دیتا۔
- تاہم یہ اقدام مذہبی آزادیوں، جائیداد کے حق اور برابری کے اصول کو زد نہیں پہنچاتا۔
- یہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے اظہار اور پرچار سے نہیں روکتا اور اس ضمن میں یہ اصول مدِ نظر رکھتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں ریاست کو کثریت پسند (pluralist) ہونا چاہیے۔ (آرٹیکل 2، پیراگراف 2)
- یہ مسلمانوں کو (وفاقی آئین کے مطابق) جائیداد کے حق سے محروم نہیں کرتا جو کہ خود مختار زندگی گذارنے کی ایک اہم شرط ہے اور اس اصول کی مدد سے آزاد ریاست اور ذمہ دار اراکین سامنے آتے ہیں (آرٹیکل 2، پیراگراف 1 اور 6) ۔ مسلمانوں کی رئیل اسٹیٹ کے حصے کے طور پر (اس سے قطع نظر کہ کمیونٹی کی تنظیم کی بنیاد کس چیز پر ہے) مینار ایک معاشرے کے حصے کے طور پر مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی تشخص کے فروغ کے لئے ناگزیر نہیں ہے۔ یہ تشخص، بحثیت انسان، ہر مسلمان کا لازمی جزو ہے اور اس تشخص کا انکار (اگر نا ممکن نہیں تو) نہایت مشکل ہے۔
- مینار مسلمانوں کے انفرادی یا اکتسابی تشخص کا لازمی حصہ ہر گز نہیں بلکہ کسی خاص خطے یا ریاست میں مسلمانوں کی موجودگی اور ترقی کی نشانی ہونے کے ساتھ ساتھ ثقافتی علامت ہے۔

جواز بذریعہ اصول تبادلہ

بین الاقوامی قانون میں اصولِ مبادلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ یہ اصول بنیادی انسانی حقوق اور بنیادی حقوق کا بنیادی حصہ ہے ۔ میناروں پر پابندی کے معاملے کی اس قانون کی روشنی میں جانچ پڑتال نہایت ضروری ہے۔ میناروں کے مسئلے کو اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک بنیادی حق جس کی ضمانت قومی قانون دیتا ہو (یا جسے بین الاقوامی قانون بنیادی انسانی حق تصور کرتا ہو) جیسا کہ مذہبی آزادی یا جائیداد کی ملکیت کا حق بین الاقوامی قانونی اصولِ تبادلہ پر عمل درآمد کرنے سے محدود ہو جائے گا؟ واضح الفاظ میں، کیا سوئٹزرلینڈ میں بسنے والے ایک مسلمان یا مسلمانوں کے گروہ اسلامی عبادات کے لئے عبادت خانے (مساجد، مینار وغیرہ) تعمیر کرنے سے روکا جاسکتا ہے یا پھر کسی خاص واقعے (یا واقعات کے پیشِ نظر) یا پھر سماجی ناپسندیدگی کی بنیاد پر ان ممالک میں جہاں یہ لوگ پیدا ہوئے ہوں، یہ بنیادی حق منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ اگر میناروں پر پابندی کے معاملے کو اصولِ تبادلہ کے بین الاقوامی قانونی اصول کی روشنی میں پرکھا جائے تو کیا سوئس وفاقی آئین کا میناروں پر پابندی عائد کرنا بین الاقوامی قوانین کے عین مطابق ہو گا؟

اصول تبادلہ وہ ذریعہ ہے جس کی بنیاد پر ریاست بین الاقوامی قوانین پر عمل درآمد کرتی ہے۔ بین الاقوامی قانون ریاستوں کے مابین ایک واسطے اور طاقت کا کام کرنے کے ساتھ حقوق اور فرائض کا بھی تعین کرتا ہے۔ جو بھی ریاست بین الاقوامی قوانین کا احترام کرے، وہ چاہتی ہے کہ، جہاں تک ممکن ہو سکے، اس ریاست سے متعلقہ معاملات میں اس کے نکتہ نظر کو سمجھا جائے۔ اگر کوئی ریاست بین الاقوامی قوانین کا احترام نہیں کرتی تو اس سے متعلق معاملات کا بھی احترام نہیں کیا جاتا۔

بین الاقوامی قانون پر عمل درآمد کے سلسلے میں ریاستوں کے مابین تعاون اور اتفاقِ رائے ضروری ہوتا ہے۔ تعاون اور اتفاقِ رائے ریاستوں کے مابین استحکام، قانون کے احترام کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ باہمی معاملات کو اثر انگیز بناتے ہیں۔ اصولِ تبادلہ (میں تم سے ویسا سلوک کروں گا جیسا سلوک تم مجھ سے کرو گے) قوموں پر زور دیتا ہے کہ وہ باہمی اتفاقِ رائے کی حکمتِ عملی اپناتے ہوئے تعاون کی فضا قائم کریں تاکہ منفی نتائج سے بچا جا سکے۔ یہ منفی نتائج عدالتی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بین الاقوامی قانونی نظم و ضبط کا بنیادی اصول ہونے کے ناطے، اصولِ تبادلہ قوموں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی ذمہ داریاں محسوس کریں۔ تاہم انسانی حقوق ایسے حقوق ہیں جن پر کوئی انسان کسی بھی ریاست میں (یا کسی بھی ریاست کے خلاف) زور دے سکتا ہے اور طلب کر سکتا ہے۔ وہ انسان انفرادی طور پر یا کسی گروہ کا حصہ ہوتے ہوئے (جسے ریاست تسلیم کرتی ہو) انفرادی اور اجتماعی حقوق پر بات کر سکتا ہے۔ جہاں کسی ایک ریاست کے بنیادی حقوق اور بین الاقوامی قوانین میں ٹکراؤ محسوس ہو، بین الاقوامی قانون کا تحفظ ضمانت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اس ضمانت کو، مختلف نظام ہائے ریاست نکتہ ہائے نظر پر بنیاد رکھنے والی بین الاقوامی اور علاقائی اقوام قبول کرتی ہیں، افراد کے کم سے کم مفاد کی ضمانت کے فوائد کو مانتی ہیں جن کی مدد سے ایک ریاست یا معاشرے کے اندر تنظیمیں جنم لیتی ہیں۔

عصری قانونی عمل اور نظریات کے مطابق، تبادلے کا اصول کا اطلاق بنیادی اور انسانی حقوق پر نہیں ہوتا۔ جہاں تک ریاستوں کے مابین تعلقات کا تعلق ہے، وہاں تبادلے کے اصول کا احترام کیا جاتا ہے۔ افراد (افراد پر مشتمل گروہ) اور ریاست کے مابین معاملات پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس لئے افراد کا ایسا عمل جو ان کے بنیادی ملک کے قانون کی خلاف ورزی گرادنا جائے، ریاست اور فرد کا معاملہ ہے۔ اقوام متحدہ بین الاقوامی قانونی کمیشن کی دستاویز کے ایک باب " بین الاقوامی طور پر مجرمانہ فعل پر ریاست کی ذمہ داری "[64] میں درج ہے کہ ریاست بنیادی بین الاقوامی قوانین پر عمل درآمد کرنے کے لئے کسی ایسی ریاست کے میں، جو بین الاقوامی قوانین کی پاسداری نہ کر رہی ہو، انسانی حقوق کو منسوخ نہیں کر سکتی (آرٹیکل 50، پیراگراف 1 ذیلی پیراگراف b)۔ مذہبی آزادی اور جائیداد کے حق کا تعلق بھی انہی حقوق سے جس کا ذکر متذکرہ بالا دستاویز میں کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ ان حقوق کے احترام کے بغیر انسان کی (فرد یا گروہ کے رکن کے طور پر) تکمیل ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ ان حقوق کے احترام کے بغیر ان اداروں اور تنظیموں کا کام بھی ممکن نہیں رہتا جنہیں انسان اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تشکیل دیتا ہے۔

---

[64]۔ یہ دستاویز اقوام متحدہ کی قرارداد Responsibility of Nations کا ضمیمہ ہے۔

انسانی ضروریات اور ریاستی نظم ونسق کے امکانات

مذہبی کمیونٹی کے لئے اپنے مذہب کے اظہار اور اس پر مل جل کر عمل کرنالازم ہے۔ اگر کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ کسی ایک مقام پر جمع ہو کر مذہبی رسومات میں شریک نہیں ہوتے اور اپنے عقیدے کا اظہار نہیں کرپاتے تو ان کا مذہب سماجی لحاظ سے خشک ہونے کے بعد منتشر ہو جاتا ہے۔ مذہبی اجلاس، اجتماعی رسومات اور میل جول کا مقصد عقائد کی منتقلی اور بیرونی لوگوں کے لئے اپنے مذہب کو پر کشش بنانا ہے۔ ان رسومات اور میل جول کی مدد سے نہ صرف اس مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مذہب کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے بلکہ یہ سب دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کی توجہ بھی حاصل کرتا ہے۔ مذہبی مقامات لوگوں کی توجہ مذہبی رسومات اور اجتماعات کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ان مقامات کا دورہ کرتے ہیں یا پھر ان اجتماعات میں شامل بھی ہوتے ہیں۔ اگر مقدس مقامات اور عبادت گاہیں خوبصورت ہوں، تو لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان کی طرف متوجہ ہو پاتی ہے۔

یہ کسی بھی مذہبی کمیونٹی کے مفاد میں ہے کہ ان کے مقدس مقامات اور عبادت گاہیں نمایاں طور پر دکھائی دیں اور قابلِ شناخت ہوں۔ ایسی عمارت پر شناختی علامات بنائی جاتی ہیں اور ان کی مدد سے مذہب کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا ہے۔ کسی علاقے میں کسی خاص مذہبی کمیونٹی کی نمائندگی کرنے والی عمارات کی تعداد اور اندازے سے اس کمیونٹی کے اثر ورسوخ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگر مسلمان مرد اور خواتین مینار تعمیر کرنا چاہتے ہیں، تو ایک صحت مند معاشرے کے طور پر ان کی ضروریات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی خواہش کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس وقت سوئٹزرلینڈ میں چار مینار ہیں۔ تاہم ان میں سے صرف ایک تک رسائی ممکن ہے۔

I. محمود مسجد، احمدیہ مسلم جماعت سوئٹزرلینڈ [65]
II. مسجد اسلامی ثقافتی فاؤنڈیشن [66] (مینار تک رسائی ممکن ہے)
III. مسجد اسلامی البانوی ایسوسی ایشن [67] (یہ مسجد ایک چھت پر تعمیر ہے)
IV. مسجد تُرک ثقافتی ایسوسی ایشن [68] (مسجد کی عمارت چھت پر تعمیر کی گئی ہے)

سوئس کنفیڈریشن کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ وہ مذہبی آزادی کا اصول مدِنظر رکھے۔ مذہبی آزادیوں کا احترام 18 اپریل 1999 کی قانون سازی (آرٹیکل 15) کے علاوہ ان بین الاقوامی معاہدوں کا تقاضا جن پر سوئس حکومت دستخط کر چکی ہے۔ ان معاہدوں میں یورپین کنونشن برائے انسانی حقوق (آرٹیکل 9 پیراگراف 1) اور بین الاقوامی کنونشن برائے سول وسیاسی حقوق (آرٹیکل 18 پیراگراف 1,2 اور 4، آرٹیکل 27) شامل ہیں۔

[65] Forchstrasse 323, 8008 Zurich
[66] chemin de Colladon 34, 1209 Geneva
[67] Kronaustrasse 6, 8404 Winterthur
[68] Olten, Industriestrasse 2, 4612 Wangen bei Olten

اس طرح مذہبی طبقات اپنے حقوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عبادت گاہیں قائم کرکے ان کا انتظام چلاتے اور اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ آج سے پہلے اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی دیگر قومیں، مثال کے طور پر ترکی بھی مذہبی آزادیوں کا استعمال مسلم فاؤنڈیشن[69] کے ذریعے کرتا ہے۔ اس مسلم فاؤنڈیشن کی نگرانی کی جاتی ہے جس کے لئے یہ ادارہ مذہبی رہنما فراہم کرتے ہیں۔ اسے سوئٹزرلینڈ کے داخلی معاملات اور مذہبی امور میں مداخلت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس صورتِ حال کی سیاسی اور عدالتی توضیح کی ضرورت ہے۔

تاہم کوئی حق غیر محدود نہیں ہے۔ اس طرح مذہبی آزادیوں کی بھی ایک حد ہے۔ مذہبی آزادیوں کا ماخذ وفاقی کنونشن برائے انسانی حقوق کا آرٹیکل 9 پیراگراف 2، اور اقوامِ متحدہ کا بین الاقوامی کنونشن برائے سول اور سیاسی حقوق (آرٹیکل 18 پیراگراف 3) ہے۔ جب ایک مذہبی نوعیت کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے، تو مسلمانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے مفادات اور معاشرے کا احترام کریں جنہیں مقامی قانون تحفظ فراہم کرتا ہے۔ میناروں اور مساجد کی تعمیر کے دوران، منصوبہ بندی پر عمل درآمد کی ہدایت کی جاتی ہے۔ ماحولیاتی اور تعمیراتی ضابطوں کا خیال رکھنے کو کہا جاتا ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھنے کو کہا جاتا ہے کہ گردونواح کے لوگوں پر ناخوشگوار اثرات مرتب نہ ہوں اور عمارت کسی بھی شہری کے لئے باعثِ اضطراب نہ ہو۔

مساجد اور مینار ماحول کا حصہ دکھائی دیں اور پہلے سے موجود عمارتوں کے لئے نقصان کا باعث نہ ہوں۔ اس کے علاوہ، کئی مذاہب سے تعلق رکھنے والے معاشروں میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ طاقت کی نمائش اور دیگر مذہبی طبقات کو اکسانے سے گریز کیا جائے۔ مساجد سے وابستہ عام مسلمان اور امام حضرات دیگر مذہبی طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے خدشات پر سنجیدگی سے غور کریں۔ مساجد اور میناروں کی تعمیر کی حمایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دوسری عمارات کی تعمیر کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ میناروں کی تعمیر سے متاثر ہونے والے تیسرے فریق کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خدشات کا اظہار کرے اور اسے یہ حق مقامی قانون (وفاقی آئین آرٹیکل 16 پیراگراف 1) دیتا ہے۔ یہ قانون نظرِ ثانی کا حق دینے کے علاوہ عدالت میں درخواست دائر کرنے، دعویٰ اور شکایت کا بھی حق فراہم کرتا ہے۔ آزاد، کثریت پسند (pluralistic) اور جمہوری معاشروں میں میناروں پر ہونے والی بحث کو جگہ دینا نہایت ضروری ہے۔ تاہم اس بحث کے دوران صحت مند اور مناسب انداز اپنانا اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری اور اہم ہے۔

[69] Türkisch-Islamische Stiftung für die Schweiz

ڈانیل زنگ

سوئٹزرلینڈ کی مسیحی بنیادوں کا دفاع

جین فرانسیس میئر

اس شام ڈانیل زنگ میکرچ کے گاؤں میں تقریر کررہے ہیں ۔ انہوں ایک اناجیلی گروپ نے تقریر کے لئے مدعو کیا ہے ۔ تقریر کا موضوع "اسرائیل: بائبل کا وعدہ اور اسلام کی غلبے کی خواہش" ہے۔ دیوار پر اسرائیلی پرچم لہرارہا ہے، میزوں پر تحریری مواد سجاہے۔ بروشرز میں سے ایک دعوت نامہ ہے جس میں اسرائیل کے دورے پر زنگ کا ساتھ دینے کی عام دعوت دی گئی ہے۔ زنگ اسرائیل کا کئی بار دورہ کر چکے ہیں۔ ان کی اسرائیل میں دل چسپی کی وجہ محض تنازعہ نہیں۔ دیگر مسیحی رہنماؤں اور عام لوگوں کی طرح وہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کے قیام کے ذریعے خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی نظریات اسرائیل کے خلاف نفرت کا بیج بورہے ہیں۔

نظریہ اسلام؛ یہ سنتے ہی زنگ کے ساتھ ہونے والے کئی مکالمے ذہن میں آتے ہیں۔ زنگ کے نزدیک اسلام مذہب کی بجائے ایک توسیع پسندانہ نظریہ ہے۔ زنگ کی میناروں کے معاملے میں دل چسپی دراصل اسرائیل کے مسئلے میں دل چسپی کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے میناروں کے مسئلے میں گہری دل چسپی لی ہے اور وہ میناروں کی تعمیر پر پابندی کی حمایت کرنے والی ایکشن کمیٹی کا بھی حصہ رہے ہیں۔

زنگ مسیحی خیراتی ادارہ "عصیبا"[70] چلاتے ہیں جو ملٹی میڈیا کے ذریعے اناجیلی تعلیمات کے فروغ میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔ اس ادارے کے دفاتر 14 سے زائد ممالک میں موجود ہیں۔

زنگ برن میں "اصلاح شدہ چرچ" کا حصہ اور وہ وفاقی جمہوری یونین کے سرگرم رکن ہیں۔ یونین سے ان کا تعلق اس وقت پیدا ہوا جب انہیں ایک بار لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا۔

ان پر" خبطِ اسلامی" کا شکار ہونے کا الزام ہے اور وہ اس الزام کو قبول کرتے ہیں۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ وہ "غلبہ اسلام کے نظریے" کے مخالف ضرور ہیں مسلمانوں کے نہیں۔ "میں ساتھی انسانوں سے ہر گز نفرت نہیں کرتا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا کوئی بھی سچا انسان دوسرے انسان سے نفرت نہیں کرسکتا"۔

زنگ کہتے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد سیکولر ہے اور وہ پرامن زندگی گذارنا چاہتے ہیں ۔ زنگ کو کثیر الثقافت معاشروں سے کوئی مسئلہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک ریاست میں کئی ثقافتوں کے مجتمع ہونے کو خوشنمار نگارنگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاہم، ان کے نزدیک، رنگارنگی کے اس کلیے کا اطلاق اسلام پر نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کے غلبہ پرست نظریات کے خلاف اس جنگ کا فائدہ دراصل

---

[70] Aseba

اعتدال پسند مسلمانوں کو ہوتا ہے۔ وہ کئی ملک بدر مسلمانوں سے مل چکے ہیں۔ ان تمام مسلمانوں نے میناروں کی مخالفت کے مسئلے پر زنگ کی حمایت کی ہے۔

”ایک عراقی مسلمان نے مجھے نصیحت کی ہے کہ میں میناروں اور غلبہ پرستی کے خلاف جنگ جاری رکھوں۔“ میں امن اور سکون کی زندگی چاہتا ہوں۔ میں آزادی چاہتا ہوں۔ مینار اور ملتی جلتی دیگر عسکری علامات کو ختم کرنے سے ہی ایک مسلمان دیگر ثقافتوں کا احترام کرنے کا ہنر سیکھے گا“۔

وینجبن مینار کا منصوبہ ایک چنگاری تھی۔ اس مینار پر ہونے والے اعتراض سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ اسلام سوئٹزر لینڈ میں کس حد تک پھیل چکا ہے۔ زنگ ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ میں اسلام کے ماننے والوں کی تعداد ہر دس سال بعد دوگنا ہو رہی ہے۔ اس لمحے سے لے کر آج تک یہ مسئلہ کسی فرد کا مسئلہ نہیں رہا۔ اب یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے۔ علاقائی کمیٹی تشکیل دی جاچکی ہے، مرکزی گروپ تشکیل دیا جاچکا ہے اور اس کے بعد اس اقدام کو قومی سطح پر اٹھایا جائے گا۔

زنگ کا خیال ہے کہ مسجد کے لئے مینار ہرگز ضروری نہیں۔ اسلامی تعمیرات کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مینار کا مذہبی آزادیوں سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ مینار غلبے اور تسلط کی علامت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

کیا میناروں پر پابندی اسلام آئزیشن پر پابندی کے مترادف ہوگی؟ زنگ کا خیال ہے کہ میناروں پر پابندی عائد کرنے سے مسلم دنیا کو ایک پیغام ملے گا۔ اگر اقدام منظور نہ ہوا تو ہر طرف کھمبیوں کی طرح مینار اگنا شروع ہو جائیں گے۔ اور بے شمار میناروں کی فصل تیار ہونے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ اگر آج میناروں پر پابندی نہیں لگائی جاتی تو کل ہمارے شہروں میں موذن کی اذان گونج رہی ہوگی۔

زنگ جانتے ہیں کہ میناروں پر پابندی کی حمایت کرنے والوں کے محرکات مختلف ہیں۔ یہ تمام لوگ اپنے مذہب کی بقا کے لئے متحرک نہیں ہوئے۔ لیکن یو۔ ڈی۔ سی کے اراکین نے سوئٹزرلینڈ کی مسیحی بنیادوں کا بھرپور دفاع کیا ہے۔

تمام مسیحی اس مسئلے سے آگاہ نہیں ہیں۔ بعض اوقات بین المذاہب مکالمے کے بائبل کے حقیقی پیغام سے روگردانی کی جاتی ہے۔ قاہرہ میں ایک تقریر میں براک اوبامہ نے قرآن کو مقدس کتاب کہہ کر بائبل کا انکار کیا ہے۔ دونوں کتب کا آپس میں کوئی بھی تعلق نہیں۔ قرآن بائبل کو جھوٹ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا خدا بائبل کا خدا ہرگز نہیں ہے۔ مکالمہ اس وقت سودمند ہوتا ہے جب اس کا نتیجہ نکلنے کا امکان ہو۔ لیکن اسلام کے پاس کوئی حل نہیں۔

زنگ کے نزدیک یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ بہت سے اناجیلی مسیحی میناروں پر پابندی کے اقدامات کی حمایت نہیں کر رہے اور انہوں نے اقدام کے مصنفین سے بات کرنے کی زحمت تک گوارہ نہیں کی۔ زنگ اپنی مایوسی نہیں چھپاتے۔ تاہم دوسری طرف انہیں تحریک کے سرگرم رہنماؤں سے یہ خبر بھی ملتی ہے کہ اس اقدام کو سراہا جا رہا ہے۔

مسلمان ممالک میں کلیسا کی تعمیر

لاؤر گورجیس

مشرقِ وسطیٰ کی اکثر ریاستیں آمرانہ سلطنتوں جیسی ہیں جہاں مذہبی، سیاسی اور ثقافتی اظہار کو قابو میں رکھنے کے لئے نت نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ یہ ریاستیں مذاہب میں تفریق کی قائل ہیں۔ یہ تفریق مراعات یافتہ اور غیر مراعات یافتہ مذاہب کے درمیان حدِ فاصل روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں میں بہائی مذہب کو ایران اور عراق میں غیر قانونی، مصر اور اُردن میں "غائب" مذہب تصور کیا جاتا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں چند اہم کلیساؤں کو کسی نہ کسی وجہ سے قانونی شناخت حاصل ہے۔ یہ کلیسا اپنی تعلیمی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کا انعقاد کرنے کے لئے مختلف ریاستی ادارے سے رابطہ کرتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا آئین (سعودی عرب، ایران اور یمن کے علاوہ) عقائد کی آزادی دینے کے ساتھ ساتھ عبادات کو اسلامی شریعہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہنا لازم قرار دیتا ہے۔ شریعہ کے علاوہ یہ آئین عام رواج کو بھی مانتے ہیں تاہم یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لئے اسلامی چلن کو فوقیت دی جاتی ہے۔

اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی تبلیغ کرنا اور اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب قبول کرنا ریاستی سرخ دائرہ عبور کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ کلیساؤں کی تعمیر اور تزئین کے لئے کچھ رسمی اور غیر رسمی ضابطوں کا خیال رکھنا لازم ہے۔ اکثر و بیشتر کلیسا کی تعمیر اور مرمت کے لئے حکومت سے خصوصی اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ اجازت ناموں کے حصول کا طریقہ کار ہر ملک میں مختلف مگر "سیدھا سادھا" ہے۔

بالفاظِ دیگر، کلیسا کی تعمیر اور مرمت کے لئے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں کیونکہ تعمیر کی منظوری کی راہ میں قانونی اور حکومتی پیچیدگیاں حائل ہیں۔ اکثر اوقات یہ ریاستیں تعمیر اور مرمت کی درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ بعض اوقات قانونی درجہ دے دیا جاتا ہے لیکن تعمیر کا باقاعدہ آغاز کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کلیسا کی تعمیر کی اجازت حاصل کرنے تک عمرِ نوح سرخ فیتے کی نذر ہو چکی ہوتی ہے۔ سرکاری ہرکارے، اعلیٰ حکام کی مرضی یا لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عبادات کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور بعض اوقات، جہاں مذہبی دفاتر نجی احاطے میں قائم ہوں، مذہبی عمارات پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

جہاں تک مسیحی چرچ کی سرکاری حیثیت کا تعلق ہے، ان ریاستوں میں کئی فارمولے موجود ہیں۔ اُردن میں کسی گروہ کو نہیں روکا جاتا تو سعودی عرب میں اسلام کے سعودی / وہابی ورژن کے علاوہ کوئی مذہب یا فرقہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ سعودی حکومت نے بادشاہ کی قیادت میں ایک پالیسی منظور کی ہے جس کے نتیجے غیر مسلموں کو نجی مقامات پر عبادت کرنے کی اجازت ہے۔ 7-2006 میں ایک حکم نامے کے مطابق مذہبی پولیس کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو گرفتار نہ کریں جو اپنے گھر کے اندر اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب پر عمل پیرا ہو رہے ہوں۔ تاہم وزارتِ

داخلہ نے مذہبی پولیس کو خصوصی تاکید کی تھی کہ تمام مشکوک افرد کو روک کر انہیں باقاعدہ پولیس کے حوالے کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی پولیس باقاعدہ پولیس کی موجودگی میں ہی غیر مسلم کو عبادت کرنے پر گرفتار کر سکتی ہے۔

حکومت کی نئی پالیسی کے مطابق، کسی شخص کی خلوت میں بے جامداخلت کرنے پر پولیس کو سزا دینے کا اختیار صرف حکومت کو ہو گا۔ تاہم مذہبی پولیس آج بھی اپنے اختیارات سے تجاوز کرتی ہے۔ حکومت کی کوشش ہے کہ مذہبی طور پر ہراساں کرنے کے عمل کو کم سے کم کیا جائے کیونکہ ان اعمال کو میڈیا میں کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے انسانی حقوق کے بہت سے ادارے حرکت میں آئے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں پوپ کے اعلیٰ افسر نے کہا ہے کہ ویٹیکن سعودی عرب میں کلیساؤں کی تعمیر کے سلسلے میں سعودی شہزادے سے بات چیت کرے گا۔

سعودی عرب میں جہاں مسیحیوں کو "بیرونی رہائشی" تصور کیا جاتا ہے حکومت زیادہ سے زیادہ لچک کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کویت میں سات سے زیادہ کلیساؤں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور اب وہ کھلے عام کام کر سکتے ہیں۔ کویت کی میونسپل اتھارٹیز نے ان کلیساؤں کی تعمیر کے لئے اجازت نامے جاری کر دیے ہیں۔

کسی مذہبی گروہ کے اندارج کا طریقہ عین وہی ہے جو کسی غیر سرکاری ادارے کو رجسٹر کرانے کا ہے۔ حال ہی نئے مذہبی گروہ سرکاری طور پر تسلیم ہو چکے ہیں۔ اس وقت مذہبی رسومات موجودہ کلیساؤں کے نجی مقامات پر ہوتی ہیں اور حکومتیں ان اجتماعات میں مخل نہیں ہوتیں۔

قطر میں حکومت ہر اس مذہبی گروہ کو قانونی حیثیت دیتی ہے جو، کم سے کم، 1500 ارکان پر مشتمل ہو۔ اس کے علاوہ یہ حکومت غیر تسلیم شدہ عبادت گاہوں کو اپنی مدد آپ کے تحت عبادت کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ تاہم قطر کی حکومت مسیحی عبادت گاہوں کو نمایاں مذہبی علامات (صلیب وغیر) کا عام استعمال کرنے سے روکتی ہے۔ تاہم اس پابندی کا مقصد مسیحی برادری کو انتہا پسند مسلمانوں سے بچانا ہے۔ نائب وزیر اعظم 2008 میں نئے رومن کیتھولک چرچ کی افتتاحی تقریب میں شامل ہوئے ہیں۔

متحدہ عرب امارات میں غیر مسلم مذہبی طبقات کو، زمین کے حصول اور گورنر کے اجازت نامے کے بعد، اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کی کھلی اجازت ہے۔ تاہم جن مذہبی گروہوں نے اجازت نامے حاصل نہیں کئے وہ تسلیم شدہ غیر مسلم طبقات کے نجی مقامات پر مذہبی اجتماعات اور عبادات کر سکتے ہیں جس پر حکومت کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

مغرب (وسطیٰ) میں مسیحی برادری کو غیر ملکی باشندے یا حالیہ نو معتقد تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی تعداد کل آبادی کا ایک فیصد ہے۔ الجیریا میں صورتِ حال اس سے بھی خراب ہے۔ یہاں حکومت آرڈی نینس کی شق 6-3 کا استعمال کرتی ہے جس کے تحت غیر مسلم مقرر کردہ احاطے کے اندر مذہبی رسومات میں حصہ لے سکتے ہیں۔

مراکش میں کئی مسیحی گروہ اپنے مذہب پر کھلے عام عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کیتھولک، روسی، یونانی آرتھوڈوکس، انگلستانی، فرانسیسی اور اناجیلی کلیساؤں کو مالی بنیادوں پر تسلیم کر لیا گیا ہے کیونکہ یہ چرچ سکول، ہسپتال اور یتیم خانے چلا رہے ہیں۔ حکومت اہم مذہبی گروہوں (مسلمانوں، یہودیوں اور مسیحیوں) ٹیکس، جائیداد اور تعمیرات کے سلسلے میں کئی مراعات دیتی ہے۔

ترکی میں مسیحی برادری کی عبادت گاہوں میں کچھ پابندیاں عائد ہیں۔ تاہم ان پابندیوں کا ان مسلمانوں کو بھی سامنا ہے جو ریاستی اعتبار سے "غیر معیاری" عقائد (مثال کے طور پر علویت) سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترکی اور مصر میں مذہبی عمارات کی تعمیر کے سلسلے میں مسیحی برادری کو تجاہل افسرانہ کا سامنا رہتا ہے اس کے علاوہ انتہا پسند مسلمان، عبادات اور اجتماعات کے دوران، انہیں تشدد کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔

ترک حکومت 1923 کے لاؤسانے معاہدے[71] کی تنگ تشریح کی قائل ہے۔ اس لئے اس نے صرف تین مذہبی طبقات (یہودیوں، آرتھوڈوکس یونانیوں اور آرمینیوں) کو اقلیتی مذاہب کا درجہ دے رکھا ہے۔ اس تنگ تشریح کے مطابق آرتھوڈوکس پاپائیوں اقلیتی مذہب تصور نہیں کیا جاتا بلکہ مذہبی فاونڈیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس مسلک سے تعلق رکھنے والوں کو ملک میں اپنے پادریوں کو تربیت دینے کی اجازت نہیں ہے۔ فاؤنڈیشن کا درجہ حاصل کرنے کا طریقہ کار طویل اور پیچیدہ ہے۔ کوئی بھی مذہبی طبقات یہ درجہ حاصل کئے بغیر جائیداد کا مالک نہیں بن سکتا۔

مزید برآں، فاونڈیشن کو بند کرنے کے لئے عدالتی حکم نامہ جب ایسوسی ایشن کو بند کرنے کے لئے صوبائی گورنر کا فیصلہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ایسوسی ایشن کا درجہ حاصل کرنے کے لئے صوبائی گورنر کے دفتر کو درخواست پیش کی جاتی ہے۔ تاہم ایسوسی ایشن، درخواست دینے کے بعد، انتظار کے تین ماہ کے اندر کام شروع کر سکتی ہے۔

کئی پروٹسٹنٹ چرچز نے معاملات کی پیچیدگیوں کی شکایت کی ہے۔ ایسے مذہبی گروہ جن کے پاس نظامت عامہ (حکومتی ایجنسی جو تمام مذہبی گروہوں کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتی ہے) کا جاری کردہ اجازت نامہ نہیں ہے، ڈپلومیٹک عمارتوں اور رہائش گاہوں میں مذہبی سرگرمیاں سر انجام دیتی ہیں۔ تاہم یہ سننے میں آیا ہے کہ پولیس ان مذہبی سرگرمیوں میں مداخلت کرتی ہے اور اس وقت بھی عدالتوں میں مسیحی برادری کے کئی افراد کے خلاف کیس چل رہے ہیں جن پر "ممنوعہ" مقامات پر مذہبی سرگرمیاں شروع کرنے کا الزام ہے۔

مصر میں 1856 میں خط ہمایونی[72] جاری کیا گیا تھا۔ یہ خط (حکم نامہ) سلطنتِ عثمانیہ کے زیر اثر تنظیموں کے فریم ورک کا حصہ تھا جو آج تک (چند ترامیم کے ساتھ) قانونی طور پر موثر سمجھا جاتا ہے۔ یہ خط غیر مسلموں کی عبادات اور عبادت خانوں کے متعلق اصول وضوابط پر مبنی ہے۔ خط کے مطابق اگر غیر مسلم عبادت گاہیں قائم کرنا چاہیں تو انہیں بادشاہ سے اجازت لینا پڑے گی۔

[71] Treaty of Lausanne
[72] *Khatt Himâyûnî*

کاپٹک مسیحی مسلمانوں اور مسیحیوں کی عبادت گاہوں کی معیار بندی عرصہ دراز سے تقاضا کررہے ہیں۔ انہوں نے پہلے پہل یہ تقاضا 1911 میں مصر کے شہر اَسیوط [73] میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں کیا تھا۔ 2005 میں مصر کے صدر حُسنی مبارک کلیساؤں کی تعمیر، مرمت اور تزئین جیسے معاملات طے کرنے کے اختیارات صوبائی گورنرز کے سپرد کردیے۔ کلیساؤں کی مرمت اور تزئین کا مسئلہ آج بھی مسلمانوں اور مسیحی برادری کے مابین تشدد کے واقعات کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ عبادت گاہوں کی معیار بندی کے لئے کئی قانونی ڈرافٹ موجود ہیں۔

ان میں سے پہلا ڈرافٹ الگوائلی [74] بل ہے جو 2005 میں پیش کیا گیا تھا۔ دوسرا بل قومی کونسل برائے انسانی حقوق نے پیش کیا تھا اور اس کی صدارت بطرس بطرس غالی نے کی تھی۔ ان اقدامات کی تکمیل میں آج بھی بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ یہ تاثر عام ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی دستاویز کافی عرصے سے سیکورٹی ایجنسیوں کے ہاتھ میں ہے اور ان پر عمل درآمد کی کوئی امید دکھائی نہیں دیتی۔ واضح رہے کہ مصر میں مسیحی آبادی 7٪ ہے۔

شام میں، لبنان کے بعد، مسیحیوں کی ایک بہت بڑی تعداد (10٪) موجود ہے۔ شام کی حکومت تسلیم شدہ مذاہب (یہودیت، مسیحیت اور اسلام) کو مفت جگہ اور محصول سے چھوٹ دیتی ہے۔ ہر مذہبی گروہ کا رجسٹرڈ ہونا لازم ہے۔ رجسٹریشن کا عمل عام طور پر نہایت طویل ہوتا ہے لیکن حکومت کسی ایسے گروہ کی مذہبی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتی جو رجسٹریشن کا انتظار کررہا ہو۔

تمام مذہبی اور غیر مذہبی گروہوں کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے اور، عبادات کے علاوہ، کسی بھی اجتماع اور اجلاس کے لئے حکومت سے اجازت نامہ لینا ضروری ہے۔ مذہبی معاملات میں حکومت کی مداخلت عام طور پر بہت کم ہوتی ہے۔

اُردن میں مسیحی کلیسا اور دیگر مذہبی اداروں کو سرکاری شناخت حاصل ہوتی ہے۔ تاہم اس شناخت کے حصول کے لئے وزیرِ اعظم کے دفتر کو درخواست پیش کرنا ہوتی ہے۔ یہ دفتر بعد ازاں چرچ کے قائدین سے معاملات طے کرتا ہے۔ چرچ کے قائدین سے مراد ایک غیر سرکاری باڈی ہے جو بشپ، یونانی آرتھوڈوکس، رومن کیتھولک اور آرتھوڈوکس آرمینی چرچز پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ باڈی مسیحی برادری سے متعلق مقدمات کی بھی ذمہ داری لیتی ہے۔ مذہبی اداروں کو حکومت کی طرف سے کوئی مراعات نہیں دی جاتیں۔ یہ ادارے، مالی یا انتظامی لحاظ سے، حکومت سے الگ اور ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ بہت سے پروٹسٹنٹ گروہ چرچ کے طور پر نہیں بلکہ کمپنی کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں مسیحی کلیساؤں کی صورتِ حال پر بہت سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں جن کی اہمیت ہر ایک ملک میں مختلف ہے۔ مسیحی کلیساؤں کے معاملات پر اثر انداز ہونے والے چند عوامل یہ ہیں؛ کوئی ریاست کس قدر آمرانہ طرز کی ہے۔ وہ سرکاری اسلام پر جس قدر عمل پیرا ہے۔ یہاں انتہاپسندی کے رجحانات عام دکھائی دیتے ہیں۔ ملک کی معاشی یا سماجی حالت کیسی ہے۔ ملک مستحکم ہے یا غیر مستحکم اور ملک میں بسنے والی مسیحی آبادیوں کی نوعیت کیا ہے وغیرہ۔

---

[73] Asyut
[74] al-Guwaylî

اینڈرڈیمیر ٹاس

اقدام سے آگے گہری کھائی ہے

پیٹرک حائینی ، سٹیفن لاثائن

اینڈرڈیمیر ٹاس تُرک نژاد مسلمان ہیں۔ وہ ایک قابلِ کاروباری اور منیجر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ سوئٹزرلینڈ میں مسلمانوں کی بدنظمی اور انتشار کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس بدنظمی اور انتشار نے مسلمانوں کو شفاف نہیں رہنے دیا اور اس وقت تمام مسلمان اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اینڈرڈیمیر ٹاس اسلام پرست تحریکوں خاص طور پر سلفی / وہابی فرقے کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ وہ سوئس حکام کے ساتھ مکالمے کا خواہش مند ہیں جو، ان کے نزدیک، اکثر پہلا قدم اٹھانے کے لئے تیار دکھائی نہیں دیتے۔

جب اینڈرڈیمیر ٹاس سے میناروں پر پابندی کے اقدام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اسے خواہ مخواہ کا مسئلہ قرار دیا۔ ان کے خیال میں دائیں بازو کی دو پارٹیاں[75] کب سے پر تول رہی تھیں۔ اب انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں رہنے والے تمام مہاجرین کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص نشانہ بنالیا ہے۔ ان کے نزدیک میناروں پر پابندی کا اقدام کسی بھی صورت میں عمل انگیز کے طور پر کام نہیں کرے گا۔ کیونکہ مسئلہ اقدام نہیں بلکہ اس کے پیدا کردہ نتائج ہیں۔

اینڈرڈیمیر ٹاس کے نزدیک میناروں کو ایک پھندے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ میناروں پر پابندی ایک سادہ تعمیراتی مسئلہ ہرگز نہیں۔ اقدام کے حامی میناروں کو خبطِ اسلام کے فروغ کا ذریعہ بنارہے ہیں۔ اس مسئلے کے ذریعے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور مغربی معاشرے کسی بھی صورت میں ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔ ان کے نزدیک میناروں پر پابندی ایک طویل المیعاد حکمتِ عملی کا پہلا قدم ہے۔ بالفاظِ دیگر معاملات میناروں سے شروع ضرور ہوئے ہیں لیکن میناروں پر ختم نہیں ہونگے۔

اینڈرڈیمیر ٹاس اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ میئر اور مقامی حکام نے مسلمانوں میں کسی بھی قسم کی دل چسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ حقیقی مکالمہ جنم نہیں لے سکا۔ یہ کس کا قصور ہے؟ اینڈرڈیمیر ٹاس کے نزدیک معاملات کو اس حد تک لے جانے کی ذمہ داری سوئس حکام پر عائد ہوتی ہے، "ریاست ایک ماں کی طرح ہوتی ہے اور اپنے بچوں کو تعلیم دیناماں کا فرض ہے"۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد حکومت کا فرض بنتا تھا کہ وہ مسلمانوں سے رابطہ کرتی اور انہیں اعتماد میں لیتی۔ اینڈرڈیمیر ٹاس کے نزدیک مسلمانوں کے ہاں خوف کی وجہ باہمی رابطے کا نہ ہونا ہے۔

اینڈرڈیمیر ٹاس مغرب اور مسلمانوں کے مابین سامنے آنے والے اختلاف کی وجہ لاعملی کو قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر حجاب کے مسئلے پر دکھائی دینے والا شدید ردِ عمل لیکن سوئٹزرلینڈ میں اس سے بھی بڑا مسئلہ مسلمانوں کے خلاف نسلی تعصب کا مسئلہ ہے۔

[75] SVP/UDC

میناروں پر پابندی کے اقدام کے جواب میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اینڈر ڈیمیر ٹاس کو ان مسلمانوں سے شکایت ہے جو میڈیا سے جڑے رہتے ہیں اور جو جلتی پر تیل کا کام کرنے سے بچنے کے لئے کوئی سیدھی بات نہیں کرتے اور اپنی ثانوی حیثیت تسلیم کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال بہتر کام یہی دکھائی دیتا ہے کہ ہم اپنا منہ بند رکھیں اور ووٹ کاسٹ کریں۔ ان کے نزدیک یو۔ڈی۔سی کی جیت کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے یہ جاننا ہو گا کہ کہاں اس کی حمایت کی گئی اور کہاں اسے رد کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اینڈر ڈیمیر ٹاس کے نزدیک یہ اقدام مسلمان شہریوں کی تربیت کا حصہ تھا۔ پہلی مرتبہ مسلمان شہریوں نے مجھ سے ووٹنگ کی ڈیڈ لائن کے بارے میں سوال کیا ہے۔

اینڈر ڈیمیر ٹاس کی تشریحات ان کے اضطراب کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ میناروں پر پابندی کے اقدام کو ایسا شر قرار دیتے ہیں جس سے خیر کا جنم بھی ممکن ہے۔

میناروں سے مسلمانوں کے سوال تک

اسلام پر تنقید کے نئے زاویے

اولیور مُوس

سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی کا اقدام خاص سیاسی پس منظر کا نتیجہ نہیں۔ اس اقدام کی حمایت کرنے والے اسے وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ یہ اقدام اپنی زبان، اپنا محاورہ اور استدلال اسلام پر عصرِ حاضر میں کی جانے والی تنقید سے اخذ کرتا ہے۔ اسلام پر عصرِ حاضر میں کی جانے والی تنقید کی شروعات اشتراکی نظریات کے تنزل اور گیارہ ستمبر 2001 کے واقعات سے ہوتی ہیں۔ میناروں پر پابندی کا اقدام اسلام پر دنیا بھر میں اٹھائے جانے والے سوالات کو یکجا کرتے ہوئے سامنے لاتا ہے اور سوئٹزرلینڈ کے سیاسی ماحول کا بھرپور استعمال کرتا ہے۔

درانتی سے ہلال تک

سرد جنگ کے خاتمے سے لے کر اب تک، دانشوروں کے ایک ایسے طبقے نے جنم لیا ہے جو اسلام (پرستی) کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اشتراکی نظریات کے خاتمے کے بعد تنقید کا نشانہ اسلام (پرستی) ہے۔ سوویت یونین کا خاتمہ مغرب کے اوّل نمبر دشمن کا خاتمہ تھا۔ اس خاتمے کے بعد مغرب نے یہ دیکھنا تھا کہ اس کے لئے دوسرا بڑا خطرہ کون سا ہے۔

ناقابلِ تسخیر سوویت مشرق–جو یورپ میں اشتراکی جماعتوں کی موجودگی کی وجہ سے "دوسرا" تصور کیا جاتا تھا–ناقابل پیمائش اور قطعی طور اجنبی مشرق میں بدل گیا ہے۔ جو اسلامی خطرات، نسبتاً کم شدت کے حامل تنازعات، ہجرت کے بہاؤ اور بین الاقوامی جرائم کا ملغوبہ ہے۔ کئی واقعات کو اس تبدیلی کا پیش خیمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ 1979 میں ایران کے اسلامی انقلاب سے 1980 سے 90 کی دہائیوں میں اسلامی عسکری مہم تک۔ 1989 میں سلمان رشدی کے خلاف پیش کئے جانے والے فتوے سے لیکر 1992 میں الجیریا کے بحران تک۔ اسرائیل اور فلسطین کے مابین تنازعات کی بڑھتی ہوئی شدت، 99-1993 اوسلو میں شروع ہونے والے عمل کا رفتہ رفتہ سرد پڑ جانے سے گیارہ ستمبر 2001 کے حملوں تک واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جنہیں مغرب کے عصری نکتہ نظر کی بنیاد کہا جاسکتا ہے۔

ان تمام واقعات کو ٹھوس شکل دے کر با آسانی اسلام پرستی کے کھاتے میں ڈالا جاسکتا ہے۔ اسلام پرستی کی اصطلاح کی کئی تعریفیں اور تشریحات ممکن ہیں۔ تاہم عام طور پر اس سے مراد مختلف قسم کی عسکری تحریکیں اور یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔

اسلام اور عصری تنقید

نومشرقی بیانیہ

مغرب کو درپیش اس نئے خطرے کو کئی نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا جاسکتا ہے۔ اسلام پر عصری تنقید کے رہنماوہی دانشور ہیں جو مینار پر پابندی کے حق میں بات کرنے والوں کو مرکزی کردار (protagonists) فراہم کر رہے ہیں۔ بالفاظِ دیگر میناروں پر پابندی عائد کرنے کی حمایت کرنے والے تحریک کار اسلام کے عصری ناقدین کی زبان اور طریقہ کار استعمال کر رہے ہیں۔

اسلام کے عصری ناقدین کا کیمپ نہ کوئی مکتبِ فکر ہے اور نہ ہی کسی معروف نظریے کا خالق ہے۔ تاہم یہ کیمپ اسلام اور مغرب کے مابین تصادم کے بیانیے کا تخلیق کار ضرور ہے۔ بیانیے سے میری مُراد اسلام سے منسوب کردہ حقائق کو مغرب سے منسلک تصورات کا تعلق جوڑنے کا عمل ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے اسلام روح کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس طریقہ کار کا پلاٹ پہلے سے تحریر شدہ ہوتا ہے۔ اس بیانیے کی مدد سے ظاہری طور پر جمہوریت کا دفاع کیا جاتا ہے اور دفاعی زبان بالکل وہی ہوتی ہے جو سرد جنگ کے دوران استعمال کی جارہی تھی اور اس بیانیے کی بنیاد کلاسیکی مشرقیت[76] سے کشید کردہ مفروضہ جات ہیں۔ یہ وہ مفروضہ جات ہیں جن کے تابوت میں آخری کیل ایڈورڈ سید نے 1970 کی دہائی میں لگایا تھا۔

ثقافتی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی ترغیبات اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں کو اسلام کے علاوہ کسی اور کسوٹی سے نہیں پرکھا جاسکتا۔ اس لئے عصری تنقید کو محض اجنبی کے خوف کا شاخسانہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ایک اپروچ ہے جو اسلام کو ایک نظریہ اور مسلمان کو اس نظریے کا پھل تصور کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ اپروچ کسی بھی تناظر اور تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرنے کی قائل نہیں ہے۔ اس لئے اس پس منظر کو، قومی اور بین الاقوامی سطح پر، آسانی سے سیاسی اور نظریاتی ایجنڈا کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

امریکہ میں، یورپ کی طرح، اس بیانیے پر یقین رکھنے والے ایسے تمام مسائل کے حل کے سلسلے میں، جن کی بنیاد اسلام دکھائی دیتا ہے، مشرق اور مغرب کے درمیان تصادم کی تمثیل کا سہارا لیتے ہیں۔ اس تناظر میں کئی منظرناموں کی وضاحت ممکن دکھائی دینے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر 1989 سے 2003 تک فرانس میں حجاب یا سر ڈھانپنے والے حجاب کا مسئلہ، سابقہ جرمن رکن پارلیمنٹ عیان ہسری علی، افغانستان پر حملے سے پہلے بش انتظامیہ کا استدلال (2009-2001)۔

اس استدلال کی بنیاد تین اہم تجزیاتی نکات پر ہے اور یہ تینوں نکات باہم گر مربوط دکھائی دیتے ہیں:

1. ہمیں مسلم دنیا کا سامنا ہے جہاں سماجی، مذہبی اور سیاسی شناخت جامد اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس دنیا میں ارتقا یا مغربی ثقافت کے اثرات قبول کرنے کا امکان اور رجحان دکھائی نہیں دیتا۔
2. اسلام جدت سے متنفر اور مستثنیٰ ہے۔ اسلام اور جدیدیت کے مابین تال میل ممکن نہیں۔

[76] Classic Orientalism

3. سکارف پہننے سے خودکش حملے تک ہر وہ عمل جس سے تشدد ظاہر ہوتا ہو اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہے۔

یہ تصورات اس لئے پرکشش دکھائی دیتے ہیں کیونکہ یہ فرانسیسی ہاؤسنگ پراجیکٹس سے لیکر پاکستان کے قبائلی علاقوں تک پیش آنے والے ہر واقعے کی تفہیم کی عالمگیر تجزیاتی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ یہ تصورات یقین اور پیشین گوئی کی صلاحیت کو جنم دے کر اور پیچیدہ مسائل کی منجمد شدہ شکل منظرِ عام پر لاکر انفرادی شخصیات کی بجائے مخصوص ثقافتی، مذہبی اور بشریاتی بہاؤ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جبریت پر مبنی یہ تصورات مفید ہیں۔ ایک طرف، یہ تصورات، مہارتیں فراہم کرنے والوں (ماہرین، عوامی دانشور، سیاست دان اور صحافی) کا پیشہ ورانہ مقام معتبر بناتے ہیں تو دوسری جانب سوویت یونین کے پیدا کردہ مشترکہ دشمن کے خلا کو پورا کرتے ہیں۔ ماہرین، صحافیوں اور عوامی دانشور ان تصورات کی مدد سے خدشات اور خطرات کے سرچشموں کی، اس بات سے قطع نظر کہ خطرات حقیقی ہیں یا پھر محض محسوس کرائے جارہے ہیں، وضاحت کرتے ہیں۔

''اسلام'' یا مسلمانوں نے ''یہ کیا'' اور اس کی بنیاد فلاں کتاب اور فلاں باب ہے۔ دوسری جانب سوویت یونین کے غائب ہونے کے بعد گلوبلائزیشن کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لئے نئے دشمن کی ضرورت ہے۔ اس وقت نیا دشمن مربوط ثقافتی بلاک ''مسلم دنیا'' ہے۔ ان تصورات کی، شعوری یا لاشعوری، بنیاد سموئیل ہنٹنگٹن (2008-1927) کے فارمولے (تہذیبوں کا تصادم)[77] پر قائم ہے۔

نو مشرقی بیانیہ اس قدر لچکدار ہے کہ اسے آسانی سے ہر قومی بحث کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس کی لچک کی مثال جاننے کے لئے سوئٹزرلینڈ میں شہریوں کے اقدام کو غور سے دیکھئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بیانیہ اس قدر ادغانی اور غیر لچکدار ہے کہ اس سے لگی بندھی تشریحات کے علاوہ کچھ اور اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

اس فارمولے کا اطلاق اسلام سے وابستہ بے شمار واقعات پر نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ یہ بیانیہ حقیقی اور مقداری لحاظ سے درست ہو سکتا ہے لیکن معیاری (qualitative) لحاظ سے غیر موثر ضرور ہے۔ بڑے یا چھوٹے پیمانے پر مذہبی علت (causality) کے اس ماڈل پر انحصار کرکے مسلمانوں کے انفرادی افعال اور حکمتِ عملی کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ مثال کے طور پر ایران میں فیصلہ سازی کے عمل کو نظریاتی سوالات میں نہیں بدلا جاسکتا۔ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ فرانس کی گلیوں میں سکارف پہن کر پھرنے والی خواتین نمونے دار کپڑا استعمال کرتی ہیں جس پر کسی نہ کسی مغربی برانڈ کا نام کندہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہم سکارف کے مظہر کو بھی ''صنفی غلامی'' کے پلڑے میں نہیں ڈال سکتے۔ خواہش کے باوجود نو مشرقی بیانیہ کوئی وضاحتی نکتہ ہرگز نہیں بلکہ ایک کہانی ہے جو صرف یہ بتاتی ہے کہ ہم کون ہیں اور ''دوسرا'' کون ہے۔

[77] Clash of Civilizations

مینار

بڑی تصویر کو چھپانے والا پردہ

میناروں کے خلاف دیے جانے والے دلائل کی بنیاد نو مشرقی بیانیے پر ہے۔ میناروں پر پابندی کی حمایت اور آئینی ترمیم کی سفارش کا ماخذ نو مشرقی بیانیہ ہے۔ کیونکہ یہ اقدام مسلمانوں کو جمہوری ممالک میں ایک مسئلے کے طور پر دیکھتا ہے۔ یہ اقدام اس تصور پر بنیاد رکھتا ہے کہ اسلام میں مذہب اور ریاست کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ اسلام کی توسیع پسندانہ فطرت کو مغرب میں آئین کی بالا دستی سے منافی کہا جاتا ہے۔ مغرب میں ان خیالات اور تصورات کے سر چشمے لاتعداد اور ان کا پس منظر مختلف ہے۔

بہت سے لوگ اور نیٹ ورکس اس بیانیہ پر مختلف (اکثر متصادم) محرکات کی بنا پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ محرکات میڈیا کی موقع پرستی سے لیکر، شہری مصروفیات اور پیشہ ورانہ مراتب تک کسی بھی نوعیت کے ہوسکتے ہیں۔ مختلف قسم کے تشہیری نیٹ ورکس، مفاد پرست گروہ کے علاوہ دانشورانہ کیمپ ہوسکتے ہیں جن کے فراہم کئے گئے الفاظ اور محاورے زبان زدِ عام کر دیے جاتے ہیں۔ یہ کیمپ اثر انگیزی اور دانشورانہ طور پر ''لطیف'' حلقوں اور مصنفین سے شروع ہو کر تھنک ٹینکس تک پھیلا ہوا ہوتا ہے[78] جہاں سیاسی تحریکیں اور اسلام پر تنقید باہم شیر و شکر ہو چکے ہیں[79]۔ یہ فضا خود کو برقی عسکریت پسند سمجھنے والے شہری تیار کر رہے ہیں جو بلاگس اور انٹرنیٹ شوکیسوں میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ ان برقی عسکریت پسندوں کی مثال دو ویب سائٹس سوئٹزرلینڈ[80] AJM اور فرانس میں لبرٹی ووکس[81] کے نام چلائی جا رہی ہیں۔

امریکہ میں اس بیانیے کے اہم شارحین میں ڈانیل پائپس (مشرقِ وسطیٰ فورم تھنک ٹینک کے ڈائریکٹر)، تحریک کار رابرٹ سپنسر، ان کی ویب سائٹ[82] اور فرنٹ پیج میگزین جس میں ڈیوڈ ہوروو ٹز اور ان کے کئی مہمان مقبول ہو رہے ہیں۔ فرانسیسی بولنے والوں میں عالمی شہرت کے حامل سیاست دان الیگزینڈر ڈیل ویلے، تاریخ دان بیٹ یي اور اسلام کے ماہر ڈیکمبرے نو مشرقی بیانیے کو عام کرنی والی اہم شخصیات ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے کا یہ طریقہ کار محض چند نظریاتی انتہا پسندوں تک محدود نہیں روایتی سیاسی اور نظریاتی حلقوں میں زبان زدِ عام ہے۔ یہ بیانیہ لمحہ بہ لمحہ سخت سے سخت ہونے کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ بلاگس میں عقیدے کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ روایتی پرنٹ میڈیا کی نسبت بہت سی رکاوٹوں سے پاک ہے۔

نو مشرقی بیانیہ مغرب میں دائیں بازو کے قوم پرستوں کے نزدیک اہم ترین موضوع ہے۔ حال ہی میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ فرانس میں آمریت مخالف بائیں بازو کی تحریکیں بھی نو مشرقی بیانیے کی آنکھ سے دیکھنے لگی ہیں اور اس کی وجہ بائیں بازو کی تحریکوں کا مذہبی پیشواؤں اور اسلام مخالف ہونا، سیکولر شناختوں کا دفاع، عسکریت پسند نسوانی تحریکیں اور انسان دوست ترقیاتی مداخلت کی وکالت ہے۔

---

[78] Professor of Journalism Paul Berman and his *Terror and Liberalism*, 2003,or the Oratoire Circle in Paris coordinated by journalist Michel Taubmann

[79] Benador Associates in New York, the Atlantis Institute in Brussels

[80] www.ajm.ch

[81] LibertyVox.com

[82] Jihadwatch.org

نو مشرقی بیانیے کے اثرات اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ اس نے یورپی میڈیا کے علاوہ دانشورانہ اور سیاسی حلقوں اور بلاشبہ سوئٹزر لینڈ کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مغرب میں اس بیانیے کا مقصد سیاسی ایجنڈے کے ساتھ ساتھ کچھ بنیادی موضوعات سے نظریاتی بوجھ اتارنا ہے۔ یہ نو مشرقی بیانیہ ہی ہے جو "عرب" کے تصور کو ہر قسم کے نسلی اور ثقافتی پس منظر سے محروم کر کے "مسلمان" کا مترادف قرار دیتا ہے۔ پیچیدہ مظاہر کو اپنی سہولت کے لئے آسان بنانے کے اس عمل نے مغربی دانشوروں کو یہ بہانا فراہم کیا ہے کہ وہ جمہوری اقدار کا دفاع کر رہے ہیں۔ مغربی عوامی دانشوروں کو اس زعم میں مبتلا کرنے میں اطالوی صحافی اوریانا فالاچی (1929–2006) کی کتاب "غصہ اور تکبر"[83] نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ نو مشرقی بیانیے کا کمال ہے کہ آج یہ لوگ فرانسیسی فلسفی رابرٹ ریڈکر کو سمجھتے ہیں۔ اس کی کتاب " اسلام کے خوف کے عالم میں کیا کرنا چاہیے "[84] اس بیانیے کے حامیوں کے نزدیک ایک اور اہم کتاب ہے۔

مینار: شناخت کا آئینہ

اسلام کو معروضی شکل دینے کے لئے دو مگر کثیر الجہت پہلو زیر کار لائے جاتے ہیں: ظاہری اور مخفی۔ میناروں پر پابندی کے اقدام سے یہ دونوں پہلو سامنے آتے ہیں۔ نیشنل کونسلر والٹر ووب مین اپنے ایک مضمون "میناروں پر پابندی کے اقدام کی وجوہات"[85] میں وضاحت کرتے ہیں:

"یہ بالکل واضح کہ اسلام کی حیثیت ایک مسیحی اور جمہوری ملک (سوئٹزرلینڈ) میں ایک اجنبی مہمان سے زیادہ نہیں ہے۔ مسلمانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ، جتنی جلدی ممکن ہو سکے، اپنے آپ کو میزبان ملک کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ ان پر لازم ہے کہ نہ صرف وہ یہاں کے قوانین اپنانے کی کوشش کریں بلکہ وہ سب کچھ جانیں اور اپنائیں جو ضابطہ تحریر میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر معاشرے میں عورتوں کا مقام اور سکولوں میں تیراکی کی کلاسز کی اہمیت۔۔۔"۔

نیشنل کونسلر جیسمن ہٹر اس بات سے متفق ہیں کہ سوئس معاشرے کے ان اصولوں کی اسلام کے نام پر روزانہ خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ مسلمان والدین اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ سکولوں میں کرسمس کی تقریبات منعقد نہ کرائی جائیں۔ جیلوں کے مینیو سے پورک ختم کرا دیا گیا ہے۔ مسلمان لڑکیاں تیراکی کی کلاسوں اور موسمِ سرما کے کھیلوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیتی ہیں۔ سوئس جمہوریت اور صنفی مساوات کی بقا کے لئے لازم ہے کہ طاقت کے حصول کے اسلامی حربوں کی روک تھام کی جائے۔۔ مینار اسلامی سلطنت کی علامات ہیں۔[86]۔ (شریعہ اور مینار، عورت کی نظر سے)[87]۔

---

[83] *The Rage and the Pride*, Rizzoli, New York, 2002

[84] Faced with Islamist intimidation, what should the free world do?]", *Le Figaro*, 19 September 2006).

[85] Les raisons du lancement de l'initiative contre les minarets

[86] minarets. ch, 8 July 2008

[87] La Sharia et le minaret du point de vue de la femme

سوئس شناخت کا تعین کرنے والے عناصر پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ یہاں مینار نئے اسلامی شعور کی مجازی شکل کا کام دیتے ہوئے حقیقت کی نمایاں علامت دکھائی دیتے ہیں۔ایسی حقیقت کی علامت جسے دبایا نہیں گیا تو نگاہوں سے اوجھل ضرور کر دی گئی ہے۔ میناروں کو معاشرے میں اسلام آئزیشن کی علامت کہا جارہا ہے۔ مینار اسلامی "دوسراہٹ"[88] (مسلمانوں کا ہجرت کر کے مغرب میں آنا، سکارف اور حجاب، زبردستی کی شادیاں اور "اسلامی" دہشت گردی وغیرہ)، مسیحی ہم وطنوں اور جمہوری اقدار کو ملیامیٹ کرنے کی دلیل سمجھی جارہی ہے۔ یہ اس بحث کا پہلا رخ ہے۔

اس گفتگو کا دوسرا رخ کچھ یوں ہے۔ سوئس شناخت ان منتشر جذبات کا مجموعہ ہے جو روزمرہ رویوں کو جنم دیتے ہیں۔ رشتے ناتے، صنفی آداب، ذوق، عادات اور عام طور پر سنائی دینے والے نکتہ ہائے نظر۔ اس طرح میناروں پر پابندی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ جو دلیل آج میناروں کی تعمیر کو جائز قرار دے گی اسی دلیل کی مدد سے کل موذن کی اذان کو بھی جائز قرار دیا جائے گا(بروشر "مینار اور ان کے معانی"[89] ملاحظہ فرمائیے)۔

اس طرح میناروں کو ایک علامتی نشان سمجھا جارہا ہے جس میں مینار کی نوک صلیب کے دل میں اترتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ شہریت کا وہ غلاف ہے جسے اسلامی غلبے نے تار تار کر دیا ہے۔ شہری مسلمانوں کی تعداد سے نہیں بلکہ اظہار سے مجبور ہورہے ہیں۔ اسلامی علامات کا تیزی سے نمایاں ہونا ان کی تردید کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے خیالات کو جنم دے رہا ہے۔

متذکرہ بروشر مختلف بیانیوں کو یکجا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک تصویر میں ترک وزیر اعظم[90] کا قول شامل کیا گیا ہے۔ دوسری تصویر میں مسلمانوں کو وفاقی محل کے سامنے دعا کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ایک اور تصویر میں مسلمان (2006–2005) ڈینمارک کارٹونسٹ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

سیاسی گروہ اے۔کے۔پی کے سربراہ اردوگان کی شخصیت ترکی میں سیاسی اسلام کی پیداوار ہے۔ ترکی یورپ کے لئے اسلامی خطرے کی گونج کے مترادف ہے کیونکہ یہ یورپ کی دہلیز پر موجود ہے۔ مسلمان ترکی سے درپیش خدشات کو نو مشرقی بیانیہ میں بنیادی مقام دیا گیا ہے۔ میناروں کو یورپ میں ٹروجن گھوڑے[91] قرار دے کر انہیں ثقافتی فتح کا پہلا قدم کہا جارہا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر نہیں رکھی جارہی کہ انتہا پسندوں کو ثقافت میں کوئی دلچسپی نہیں۔

اسلام میں قربانی کی رسم کو خونخوار عمل کہا جاتا ہے۔ اس طرح میناروں کا انکار "اسلامی تشدد" کا انکار ہے۔ بروشر میں دکھائے گئے دعا کرتے ہوئے مسلمان اس بات کی علامت ہیں کہ ہماری حکومت کا بیرونی افواج نے محاصرہ کر لیا گیا ہے۔

---

[88] Otherness
[89] Le minaret et sa signification
[90] R Tayyip Erdogan
[91]۔ یونانیوں نے ٹرائے میں داخل ہونے کے لئے کاٹھ کا گھوڑا بنایا تھا جسے ٹرائے کے (ٹروجن) سپاہی فتح کی یادگار سمجھ کر قلعے کے اندر لے گئے تھے لیکن کاٹھ کے اس بہت بڑے گھوڑے میں یونانی فوج چھپی ہوئی تھی جس نے رات کے اندھیرے میں قلعے کے دروازے کھول دیے تھے اور اس طرح ٹرائے فتح کر لیا تھا۔

میناروں پر پابندی کی حمایت کرنے والوں نے جن علامتوں اور دلائل کو پیمانے کے طور پر استعمال کیا ہے، میناروں کا رد کرنا اسلام کو رد کرنے کی ایک علامت ہے۔ تاہم پابندی کی حمایت کرنے والے مرکزی کردار اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اقدام میناروں کو سیاسی اور نظریاتی روشنی میں دیکھتا ہے جس سے گفتگو معقولیت کی حدوں سے دور نکل جاتی ہے۔

اقدام کا آغاز کرتے وقت قومی کونسلر آسکر فریسنجر سے واشنگٹن ٹائمز کے رپورٹر نے سوال کیا کہ اسرائیل کو اسلامی خطرے کے بیانیے میں کیا مقام دیا گیا ہے تو فریسنجر نے حیران کن انکشاف کیا۔

"ہماری جماعت نے اسرائیل کی ہمیشہ حمایت کی ہے۔ اگر اسرائیل نہ رہا تو ہم اپنے محافظ سے محروم ہو جائیں گے۔۔ جس وقت تک مسلمانوں نے اپنی توجہ اسرائیل پر مرکوز کر رکھی ہے۔۔ اس وقت تک مسلمان ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔۔ لیکن جب اسرائیل غائب ہو گیا تو مسلمان مغرب کا رخ کریں گے۔۔ میں دائیں بازو کی جماعتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی توانائیوں کو یکجا کرتے ہوئے اسلام آئزیشن کا مقابلہ کریں"[92]۔

مینار اسلام آئزیشن کی اس قدر واضح علامت نہیں ہے جس قدر واضح وہ علّم ہے جو اسلامی شناخت سے لاحق خطرات ظاہر کرنے والوں نے اٹھا رکھا ہے۔ یہ خدشات حقیقی نوعیت کے ہیں یا پیدا کئے گئے ہیں یہ ایک الگ بحث ہے تاہم انہیں سیاسی ہتھیار کے طور پر ضرور استعمال کیا جا رہا ہے۔ میناروں کی مخالفت سے قطع نظر، حقیقی مسئلہ اسلام کے نمایاں ہونے اور اس کی تشریح کا ہے۔

---

[92] Diana West, "A Swiss 'Extremist' Against Islamic Law", *Townhall.com*, 17 July 2008

مینار

مسلمان غصے کا اظہار نہیں کر رہے

حسام طمام

میناروں پر پابندی کے مسئلے پر رائے شماری کے بعد یہ توقع کی جارہی تھی مسلم دنیا میں ویسا ہی شور اٹھے گا جیسے ڈینمارک میں بنائے جانے والے خاکوں کے بعد اٹھا تھا۔ دنیا بھر میں ہڑتالیں اور مظاہرے دیکھنے میں آئیں گے اور سفارت خانوں پر حملہ کیا جائے گا۔ رائے شماری کے بعد ایک سال گذر چکا ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مسلم دنیا خاموش ہے۔ اسلام سے جس قدر شدت منسوب کی جاتی ہے اس شدت کا دارومدار ہمیشہ معروض(object) کی الٰہیاتی نوعیت پر رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں کے نزدیک "مینار" اس قدر تقدس کا حامل نہیں ہو سکتا جس قدر پیغمبرِ اسلام کی ہستی ہو سکتی ہے۔ اس سے ایسے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں طاقت کے توازن کا اصول بھی سامنے آتا ہے جن میں اسلام کے خلاف کسی بھی معاندانہ عمل کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ اگر معمر قذافی کے ردِ عمل کو استثنیٰ قرار دیا جائے تو گلیوں سے لیکر مسلمانوں کے بین الاقوامی اداروں تک اسی توازن کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مینار

غیر ارادی ہدف

مینار کی مذہبی حیثیت جذباتی نوعیت کی تو ہو سکتی ہے (اور اس کا سیاسی استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو شدید ترین احتجاج پر بھی اکسایا جاسکتا ہے) لیکن اس کا تقدس، مسلمانوں کے نزدیک، پیغمبرِ اسلام کی ہستی کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ مینار کو اس قدر اہم نہیں سمجھا جاتا ہے جس قدر حجاب یا پردے کو سمجھا جاتا ہے۔ حجاب اور پردہ غالب مذہبی عقیدے کی روشنی میں ایک اہم مذہبی فریضہ ہے۔

میناروں پر پابندی عبادت پر پابندی کے مترادف نہیں ہے۔ بہت سے مسلمان میناروں کو اضافی لوازمات میں شمار کرتے ہیں۔ وہابی تحریک بھی، جو مذہبی معاملات میں سب سے زیادہ غیر لچکدار تصور کی جاتی ہے، میناروں کے مسئلے کو اس قدر اہمیت نہیں دیتی ہے کہ اسے اسلام پر حملے کے مترادف سمجھا جائے۔ تاہم یہ فرقہ میناروں پر پابندی کو اسلامی عقائد پر حملہ قرار دیتا ہے۔

وہابی ردِ عمل کی ایک بنیادی وجہ اس فرقے کا ظاہری معانی و مطالب سے پر یقین رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ وہابی فرقے کے نزدیک مینار از خود ایک مسئلہ ہے۔ لیکن چونکہ میناروں پر پابندی کے حامی مینار کو فتح کی علامت سمجھتے ہیں، وہابی اسے تعمیراتی ضمیمہ قرار دینے لگے ہیں جس پر کسی بھی عقیدے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چونکہ مینار ظہورِ اسلام کے وقت وجود نہیں رکھتے تھے، اس لئے وہابیوں کے نزدیک مینار بھی ایک بدعت ہے۔ اس لئے وہابی فرقہ مینار کو اس قدر غیر اہم مسئلہ سمجھتا ہے جس پر بات نہ کی جاسکتی ہو۔

وہابیوں کے نزدیک مینار سے مسجد کا بنیادی مقصد فوت ہوجاتا ہے جو صرف عبادت ہے۔ یہاں پر وہابی وہی دلیل پیش کر رہے ہیں جو میناروں پر پابندی کے حامی پیش کر رہے تھے کہ مینار مسجد کی تعمیراتی ضروریات کا حصہ نہیں ہیں۔

میناروں پر پابندی کی حمایت کرنے والوں کے نزدیک میناروں کا وجود سوئٹزرلینڈ کی شناخت پر حملے کے مترادف ہے۔ یہ نکتہ نظر مسلمانوں میں سلفی نظریات کی گونج ہے جو "اسلام کے تحفظ" کی تگ و تاز میں مگن ہیں۔ مثال کے طور پر بیروت میں ڈینمارک کے سفارت خانے کے جلاؤ گھیراؤ پر اکسانے والے سلفی ہی تھے۔

لبنان میں ایک سلفی رہنما نے اعلان کیا ہے، "میناروں پر عائد کردہ پابندی دراصل ایک تعمیراتی سجاوٹ پر پابندی ہے جسے ہم شروع سے غیر اسلامی بدعت تصور کرتے ہیں"۔ مصر میں جہاں سلفی تحریک اسلام پر حملوں کی مذمت کرنے کے سلسلے میں نہایت متحرک دکھائی دیتی ہے، کسی بھی سلفی رہنما نے سوئٹزرلینڈ میں میناروں کی پابندی پر کوئی بیان نہیں دیا۔ تاہم بعض حلقوں میں، غیر رسمی طور پر، اس کی مذمت ضرور کی گئی ہے۔

اخوان المسلمون

تشخص کا مسئلہ

عرب دنیا میں اخوان المسلمون کے حمایتی حلقوں میں میناروں پر پابندی کے فیصلے کے خلاف کوئی ردِ عمل دکھائی نہیں دیتا۔ پارلیمنٹ میں اس اقدام کی مذمت ضرور کی گئی ہے لیکن اس کے پابندی کے خلاف تحریک سازی کا رجحان دکھائی نہیں دیا۔ اس دوران اخوان المسلمون کی پوری توجہ ٹیری جونز کے قرآن کو نذرِ آتش کرنے کے منصوبے پر مرکوز رہی ہے۔ عرب دنیا اور مصر میں میناروں کے موضوع پر خاص مزاحمت دکھائی نہیں دی۔ بااثر اسلامی حلقوں اور پیشہ ور باڈیز نے بھی اس پابندی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

تاہم شیخ القارادوی، مسلمان عالم اور براڈکاسٹر، وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے الجزیرہ ٹی وی پر مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ سوئس مصنوعات کا بائیکاٹ کریں۔ تاہم ان کی اس اپیل کو کہیں پر بھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔

یوں لگتا ہے کہ عرب دنیا نے ڈینمارک میں بننے والے توہین آمیز خاکوں پر اخوان المسلمون کے ردِ عمل سے بھرپور سبق سیکھا ہے۔ شاید عرب دنیا میں مغرب کے خلاف دھواں دھار تنقید اور متشدد ردِ عمل سے گریز کرنے کی یہی وجہ ہے۔

اسلام کا دفاع

اسلام پرستوں کی اجارہ داری میں کمی

یہ ایک حیران کن اور واضح حقیقت ہے کہ اسلام کو درپیش چیلنجز سے اسلام پرستوں کوئی سروکار نہیں۔ یہ چیلنجز اس وقت سیاسی طاقتوں کے لئے تحریک سازی کا موقع ضرور پیدا کرتے ہیں اور یہ عمل عرب حکومتوں میں کئی سطح پر جاری دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مصر میں حکومت فوری طور پر حرکت میں آئی اور اس نے مصطفیٰ الفقہی کی قیادت میں ایک گروپ تشکیل دیا اور یہ گروپ سوئٹزرلینڈ کے دورے پر روانہ کر دیا گیا۔ فوری طور پر حرکت میں آنے کی یہ حکمتِ عملی مذہبی افسران کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے اس لئے اس کے اثرات گلیوں اور چوراہوں میں دکھائی نہیں دیتے۔

عرب دنیا کے پس منظر میں سوئس ریفرینڈم پر سامنے آنے والا ردِ عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت اسلام پرستوں کو مقابلے کی صورتحال کا سامنا ہے۔ اس صورتِ حال میں شدت پسند ردِ عمل ظاہر کرنے کی ذمہ داری "دوسروں" پر ڈال دی جاتی ہے جن میں، عام طور پر، ریاستی نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں۔

تاہم اسے کھلا تضاد تصور نہیں کرنا چاہیے۔ مسلم دنیا کے قائدین جو سفارتی یا سیاسی طور پر معتدل دکھائی دیتے ہیں وہ بھی، بعض موقعوں پر، شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصر کے مفتی اعظم علی گوما نے کہا ہے:

" سوئس ریفرینڈم نہ صرف مذہبی آزادیوں پر حملہ ہے بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی بھی توہین ہے "۔

انہوں نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس قسم کے اقدامات مسلم دنیا میں انتہا پسندی کے فروغ کا باعث بن سکتے ہیں۔

ابلاغِ عامہ کے ذرائع سے منظرِ عام پر آنی والی سوئس حکومت پر تنقید محض اسلام پرستوں کی طرف سے نہیں تھی۔ ابلاغِ عامہ اور نظریاتی بات چیت میں اسلام پرست دانشوروں، قدامت پرست صحافیوں، قوم پرستوں کے خیالات سامنے آئے۔ حکومتی جرائد، جو یہ نہیں چاہتے کہ کسی موقع پر کوئی ان سے سبقت لے جائے، عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے لبرل طاقتوں کے خلاف اقدامات سامنے لاتے رہے۔

جب بھی اسلام اور اسلامی معیارات کی بات ہو مصر پر، سفارتی سطح پر، عرب دنیا کے رہنما ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ مصر عرب دنیا میں اپنے آپ کو اسلام کا دفاع کرنے والے سرخیل کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ یہ پوزیشن اس سے قبل سعودی عرب نے اختیار کر رکھی تھی۔ اقوامِ متحدہ کے حلقوں میں مصری ڈپلومیٹ اسلام کا دفاع کرتے ہوئے اسلام کی یگانگت اور انسانی حقوق کے تحفظ کے وعدوں کا ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہر فورم پر یہ بات دہراتے ہیں کہ اسلام مذہبی آزادی اور دوسرے مذاہب کے احترام کا درس دیتا ہے۔

اسلامی کانفرنس کی تنظیم اور اتحاد بین التہاذیب جیسی تنظیموں کی طرف سے سامنے آنے والی تنقید سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اسلامی دنیا میں ایک نئے محاذ کا آغاز ہونے جارہا ہے۔ یہ محاذ لبرل ازم پر (جو کہ بین الاقوامی حکام کی اکثریت کا پسندیدہ نکتہ نظر ہے) قدامت پسند اور مذہبی نکتہ نظر سے سوال اٹھارہا ہے۔

عرب گلیاں

خاموش طاقت

عرب گلیوں میں خاموشی کا راج ہے۔ عرب دنیا کے غصے کے دبے رہنے ایک وجہ میناروں کا "کم مقدس ہونا" بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم میناروں پر پابندی کے مسئلے کو اسلام مخالفت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ سیاسی اور سفارتی حلقوں میں ردِ عمل کا مقصد عوامی امنگوں پر پورا اترنے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

اس وقت انٹرنیٹ پر میناروں پر پابندی کے اقدام کے خلاف بات ہو رہی ہے۔ ان میں سے سب سے اہم سوئس مصنوعات کا بائیکاٹ کا اپیل کرنے والی ایک مہم ہے جس کا نعرہ "وہ ہمارے مینار نہیں چاہتے" ہے۔ تاہم اس مہم کے اثرات ڈینمارک میں بننے والے خاکوں کے بعد سامنے آنے والی مہم کی نسبت نہایت کم ہیں۔ ڈینمارک کا بائیکاٹ کے لئے کئی بائیکاٹ کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں اور مختلف سماجی تحریک سازوں، اسلام پرستوں، پیشہ ور جماعتوں نے اس تحریک کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا تھا۔

عرب گلیاں خاموش ہیں کیونکہ عرب دنیا میں ردِ عمل نے اپیلوں اور مذمت سے بڑھ کر منظم مظاہروں کی شکل اختیار نہیں کی۔ مسلم دنیا میں پاکستان اور نیم صحرائی ممالک کے علاوہ کہیں بھی سوئس ریفرینڈم کے خلاف احتجاج دیکھنے میں نہیں آیا۔ ان مظاہروں کی اپیل معمر قذافی کی قیادت میں ورلڈ اسلامک سوسائٹی نے کی تھی اور ان مظاہروں میں شرکا کا جوش و جذبہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

سوسائٹی نے "کفار کی نسل" کا بائیکاٹ اور اس کے خلاف جہاد کی اپیل کی کیونکہ انہوں نے خدا کے گھر پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت تک مذہبی علامات مختلف تنازعات کی وجہ بنی ہوئی ہیں لیکن ان علامات کی وجہ سے اب زیادہ تر لوگ حرکت میں نہیں آتے۔ میناروں کو زیادہ تقدس حاصل نہیں، اس لئے عرب دنیا آج بھی خاموش دکھائی دیتی ہے۔ لبنان میں چند رہنماؤں کی قیادت میں سوئٹزرلینڈ کے خلاف کچھ احتجاجی مظاہرے سامنے آئے ہیں تاہم ان کی وجہ مینار نہیں بلکہ جینوا میں معمر قذافی کے بیٹے کی گرفتاری تھی۔

ماحصل

میناروں کی چوٹی سے

علامات اور سماجی نسیان

اولیور مُوس ، پیٹرک حائینی

میناروں کا معاملہ سیاسی لحاظ سے کوئی اجنبی واقعہ نہیں اور نہ ہی یہ کوئی ایسے تعجب کی بات ہے جسے سوئس استثنایت پسندی[93] کی مدد سے جانا جاسکے۔ میناروں کے معاملے کو فرانس میں برقعے (2009)، ڈینمارک میں توہین آمیز خاکوں (2006-2005) اور ڈچ پارلیمنٹ کے رکن گرٹ وائلڈر کی زیر ہدایت بننے والی فلم "فتنہ" (2008) جیسا معاملہ تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم میناروں کا معاملہ دیگر نزاعی معاملات سے مختلف ہے۔ اسلام اور سوئٹزرلینڈ کے مابین نزاعی مسائل (تیراکی کی کلاسز، حجاب، حلال گوشت، قبرستانوں میں مسلمانوں کے لئے مخصوص جگہ یا 1990 کی دہائی میں سوئٹزرلینڈ میں ملک بدر اور غیر قانونی اسلامی جماعت FIS کے نیٹ ورکس کی موجودگی) نے مقامی طبقات اور ان کے داخلی معاملات کی وجہ سے جنم لیا ہے۔

میناروں کا سوال اسلام اور مغرب کے مابین بڑھتے ہوئے تناؤ اور خلیج کا ایک نیا باب ہے۔ اس وقت، اسلامی معیارات کی بجائے، علامات اور نشانوں کو خطرات لاحق ہیں۔ مغرب اور اسلام کے مابین تناؤ کا یہ نیا باب روزمرہ زندگیوں سے بالکل کٹا ہوا ہے۔ اس وقت سوئٹزرلینڈ میں صرف چار مینار ہیں اور نئے میناروں کی تعمیر کے لئے بہت کم درخواستیں جمع کرائی گئی ہیں۔ جہاں تک برقعے کا تعلق ہے، فرانس میں برقعہ پہننے والی خواتین کی تعداد بہت کم ہے اور اس مسئلے نے فرانس کے مسلمان طبقات میں انتہائی نوعیت کے نزاعی معاملے کی شکل اختیار کرلی ہے۔

معاشرے کے اسلام پرست طبقات برقعے کی بجائے حجاب کے حق میں دکھائی دیتے ہیں۔ ڈینمارک میں توہین آمیز خاکوں کا معاملہ ہرگز منظرِ عام پر نہ آتا اگر یہ شیخ کی نظر سے بچ جاتا اور وہ اسے عام نہ کرتا اور یہی بات فتنہ نامی فلم پر بھی صادر آتی ہے۔

بالفاظِ دیگر، یہ مسلمان اسلام کے علاوہ عام مسلمان کو متاثر نہیں کرتے۔ میناروں پر پابندی کی حمایت کرنے والے کئی تحریک ساز اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ "خبطِ اسلامی" کا شکار ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو اجنبی انسانوں اور ثقافتوں سے نفرت کرنے والے انسان ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق، ان کا ہدف مخصوص آبادی اور رسم و رواج نہیں بلکہ ایسا اسلام ہے جسے نظریے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اس منطق کا دہرا استعمال ممکن ہے۔ چونکہ یہ مسلمان ہی ہیں جو غصے میں آجاتے ہیں، جیسا کہ ڈینمارک میں توہین آمیز خاکوں کے سلسلے میں دیکھا گیا ہے۔ دو مخالف نکتہ ہائے نظر ایک ہی ترانے کی دھن میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں فریقین علامات کو موضوع بنا کر ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں اور معاملات کی کے پس منظر میں سماجی حقائق کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک جانب اسلام کے ظاہری پہلوؤں کا دفاع کیا

[93] exceptionalism (*Sonderfall Schweiz*)

جاتا ہے تو دوسری جانب جانب اس کی علامات مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ لبنان میں سفارت خانے کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس کی وجہ جاب مارکیٹ میں امتیازی رویہ یا تشدد کا کوئی واقعہ نہیں بلکہ خاکے تھے۔

یہ علامتی ترانہ اس لئے گایا جارہا ہے کہ یورپی اسلام وجود رکھتا ہے۔ یہ باہر سے ہجرت کر کے آنے والوں کا اسلام نہیں رہا بلکہ مغرب کے مذہبی، سماجی اور شہری منظر نامے کا جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نمایاں ہونے پر یہ مسائل جنم لے رہے ہیں۔ اسلام کی موجودگی کی وجہ سے مغربی معاشروں پر سوال اٹھتے ہیں اور مغربی معاشرہ پہلے ہی بحران کا شکار ہے۔ بحران کا شکار مغربی معاشروں میں سوئٹزرلینڈ بھی شامل ہے جو اس وقت معاشی، گلوبلائزیشن، کھلی سرحدوں اور اکلوتی مارکیٹ جیسے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ مذہبی خطوں کی قدیم مساوات پرانی ہو کر دم توڑ چکی ہے۔

یورپی یونین میں مسلمان ترکی کی شمولیت، جسے "یہودی- مسیحی" زاویے سے بھی دیکھا جاتا ہے، اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ سیاسی معاملات شناخت کی قومی اور برِاعظمی بحث کی نفی کرتے ہیں۔

میناروں پر پابندی کی حمایت کرنے والے جس بحث کا آغاز کرنا چاہتے تھے وہ شروع ہوچکی ہے۔ تاہم یہ ابھی تک واضح نہیں ہوا کہ اس کا آغاز درست انداز میں کیا گیا ہے یا نہیں۔ کیونکہ علامات زمین اور زمینی معاملات سے ماوراو بلند ہوتی ہیں۔ اسلام کی نوعیت پر فکری مباحث (آیا کہ اسلام فاتحانہ مزاج کا حامل ہے، سیکولرازم سے مطابقت رکھتا ہے) کا ہونا یقینی دکھائی نہیں دیتا۔ ان مباحث کی مدد سے میناروں پر پابندی یا برقعے سے متعلق تنازعات کو سلجھایا جاسکتا تھا۔ برقعے کی علامات انسان کو شک میں مبتلا کر دیتی ہے کہ خواتین کی آزادی کی منزل ابھی تک نہیں آئی۔ تاپھر سکولوں میں تیراکی یا ورزش کی کلاسز سے بائیکاٹ کا مسئلہ بھی ان مباحث کی بنا پر سمجھا جاسکتا ہے۔

مغرب میں اسلام کے نام پر اجنبی طرزِ زندگی اور عادات سے واسطہ پڑنا جو ہماری روزمرہ زندگیوں کو پریشانی سے دوچار کر رہی ہوں، قومی اتفاق کے نصب العین کو دھندلا کر رکھ دیتی ہیں۔ یہ صورتِ حال تردید اور الزام کے جذبات کو ہوا دے سکتی ہے۔ ان احساسات کا جنم لینا تعجب کی بات نہیں جب ابلاغِ عامہ کے ذرائع ایسے اسلام کی شکل کا تعارف بغداد کے خودکش حملہ آوروں، گھات لگائے ہوئے طالبان، پرتشدد واقعات میں ملوث انتہا پسند، ٹریپولی میں آقاصفت حکمران کو اکسانے والے شرانگیزوں کی صورت کروار ہاہو۔ اسلام سے منسوب ہر چیز اجنبی اور حیرت انگیز ہے۔ اس سے منسوب ہر عمل سے عدم برداشت اور تشدد کے علاوہ کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ اسلام کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والے کسی تعصب یا اسلام دشمن نظریے سے متاثر نہیں ہیں۔ بلکہ اسلام کی موجودہ تصویر اور حالاتِ حاضرہ نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھیں۔ مسلمانوں کے موجودہ چلن اور حالاتِ حاضرہ پوری دنیا، بالخصوص مغرب کے لئے، پریشانی کا باعث ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کو اس بے چینی کی واحد وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اگر ہم موجودہ مسائل کا پائیدار حل تلاش کرنا چاہتے ہیں تو علامات کے ترانے پر رقص کرنا کسی صورت میں فائدہ مند نہیں ہے۔ تو اس ترانے پر کان دھرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ اس ترانے کی آواز اس قدر بلند ہوچکی ہے کہ اس کے علاوہ کچھ اور سنائی نہیں دیتا۔ سوئٹزرلینڈ میں اسلام کی متنازعہ حیثیت سے لیکر عالمی میڈیا کی پریشان کن تفہیم تک، میناروں پر پابندی کے حق میں آواز بلند کرنے والوں سے لیکر مسلم دنیا میں

مسیحی آبادی کی زبوں حالی تک، اس کے علاوہ دہشت گردی اور امیگریشن سب اس گفتگو، اس مکالمے کو جائز اور بروقت قرار دے رہے ہیں۔ میناروں کے خوف کے پیچھے موذن اور مبلغ کا خوف ہے۔ اس خوف کے پس منظر میں خود اعمالی کی خوفناک دھن ہے جو مسلسل اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

میناروں کا مسئلہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ اس سے ایک بحث جنم لے سکے۔ ایک ایسی بحث جس کی مدد سے ہم اپنے سماجی، قانونی، سیاسی اور شناخت کے مسائل کا جائزہ لے کر ان کا عملی حل تلاش کر سکیں اور ان چیلنجز سے نمٹ سکیں جن کی بنیاد سوئٹزرلینڈ میں بسنے والے مسلمانوں سے روزمرہ تعلق اور تعامل ہے۔ علامات حقیقی طاقت کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن میناروں کو ایسی آواز بننا چاہیے جو ہمیں زمین پر واپس لے آئے اور ہماری توجہ زمین کے حقیقی مسائل کی طرف مبذول کرائے۔

حرف آخر

یورپ میں اسلام
دوسرے مذاہب کی طرح عام مذہب

آلیور روئے

1980 کی دہائی میں اجنبیوں کے خبط کا شکار یورپ کے دائیں بازو کی جماعتوں نے مہاجرین کی واپسی کے لئے تحریک چلائی جس کا نعرہ یہ تھا: تارکین واپس جاؤ!
فرانس میں قومی محاذ کے جین میری لی پین کے پوسٹر زیر تحریر تھا: "دس لاکھ بے روزگار، دس لاکھ مہاجرین بہت زیادہ ہیں"۔

ان حملوں کا نشانہ غیر ملکیوں کا اجنبی کلچر تھا۔ پیرس کے میئر یاک شیراک کا شمالی افریقہ کے ساؤس کی باس کے متعلق بیان ملاحظہ فرمائیں جو اپارٹمنٹ کی عمارتوں سے اٹھتی محسوس ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں بحث کا موضوع غیر ملکی کلچر نہیں بلکہ مذہب ہے۔ موضوع وہ تارکین ہیں جنہوں نے بہت سے مغربی ممالک میں شہریت حاصل کرلی ہے۔ اس لئے آج کی بحث کا موضوع اسلام ہے امیگریشن نہیں۔ اسلام جو آج کل اخباری کالموں اور ٹیلی وژن نشریات کا بنیادی موضوع ہے۔ اسلام اس وقت دائیں بازو کی عوامی جماعتوں اور کئی دیگر حلقوں میں موضوع بحث بن چکا ہے۔ تاہم یہ بحث اسلام کی خارجی علامات پر مرکوز ہے۔ بحث کا مرکز عوامی مقامات پر اسلام کا نمایاں ہونا ہے۔ سکارف، برقعہ، مسجد، مینار اور ہوٹلوں میں حلال مینیو!

اس وقت مسئلہ تارکین کی موجودگی کا نہیں بلکہ اسلام کے منظرِ عام پر آنے کا ہے۔ یہ مسئلہ ظاہر کرتا ہے کہ یورپ میں مسلمانوں نے اپنی بنیاد قائم کرلی ہے اور تمام مسائل انہی بنیادوں سے اٹھ کر منظرِ عام پر آرہے ہیں۔
تاہم وہ لوگ جو اسلام پر تنقید کرتے ہیں، مغرب میں اسلام کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اسے مخفی رکھنے کی حمایت کرکے کھلے تضاد کے مرتکب ہورہے ہیں۔ اس وقت مسئلہ امیگرنٹس کو ملک بدر کرنے کا نہیں بلکہ ان کے بچوں کو اس قسم کے اسلام پر عمل کرنے سے بچانے یا انہیں "داخلی غیر ملکی" قرار دینے کا ہے۔

عصرِ حاضر میں اسلام کا نمایاں ہونا اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک طرف یہ اس بات کی علامت ہے کہ یورپ اور اسلام ہم آہنگ ہورہے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کی موجودگی جارحیت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے کیونکہ اسلام اس نازک توازن کو بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے جو تیز و تند تاریخی واقعات کا ثمر ہے۔ ایسی تاریخ جس میں پہلے پہل مذاہب ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہے اور اس کے بعد ایک سیکولر معاشرے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور جمہوری ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ یورپ میں اسلام کی آمد سے قطع نظر مغرب کے غیر مسلموں کا بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلام، بطور مذہب، مغربی معاشرے سے تال میل یا مطابقت رکھتا ہے؟

مطابقت کا سراب

بحث

اسلام کی مغرب سے مطابقت پر ہونے والی بحث ہار جیت کے فیصلے کے بغیر تعطل کا شکار ہو چکی ہے۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ ہمیں کیا کچھ زیرِ بحث لانا ہے۔ اگر ہم مغربی اقدار کا تقابل اسلامی اقدار سے کریں تو ہم مشترکہ مغربی اقدار کی تعریف کیسے کریں گے کیونکہ کیتھولک چرچ لبرل اور سیکولر اقدار کی مخالفت کرتا ہے۔ کیتھولک چرچ خاندانی منصوبہ بندی، عورت اور جنسی امور پر لبرل اور سیکولر اقدار کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری طرف اگر ہم اسلامی اقدار کی تعریف کرنے کی کوشش کریں، تو ہمارا واسطہ مختلف اور باہمدگر متصادم آرا سے پڑتا ہے۔ دنیا بھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جو متفقہ علیہ اسلامی اقدار کی تعریف کر سکے اور یہ بتا سکے کہ یہ اقدار "حقیقی اسلام" کی نمائندگی کرتی ہیں۔

اس بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مغرب اور اسلام دو چٹانیں (monoliths) ہیں۔ دونوں اطراف داخلی تنازعات اور انتشار کا شکار ہیں۔ تاہم مسیحی اور مسلم پس منظر کے حامل افراد کے درمیان رابطوں اور تعلقات کی ایک نئی تاریخ رقم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ مثال کے طور پر الجیریا کی کچھ خواتین فرانس میں سکارف کی شدت سے مخالفت کر رہی ہیں جبکہ کچھ کیتھولک سکارف کے معاملے پر کشادہ دلی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس وقت کچھ کیتھولک سکولوں میں مسلمان بچیوں کو سکارف پہننے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

اگر اسلام کے ظاہری پہلوؤں پر اس قدر توجہ دی جا رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رائے عامہ ابھی اس نتیجے تک نہیں پہنچی کہ اسلام کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ اس غیر یقینی صورتِ حال میں بہت سے یورپی معتدل، محتاط اور مخفی اسلام کو "اچھے اسلام" سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔

مذہبی علامات (سکارف، مینار، برقعہ) پر ہونے والی بحث "کم سے کم اسلام" کی تعریف وضع کرنے پر اکساتی ہے جو موجودہ یورپ سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس مطابقت کی بنیاد مشترکہ اقدار پر نہ سہی مگر اس کی مخفی یا ذاتی نوعیت پر قائم ہو۔ سکارف، برقعے اور مینار کو رد کرنے کا مطلب انتہا پسند اسلام کو رد کرنا ہے۔ اسلام کی یہ تینوں ظاہری علامات اسلام کو انتہا پسند نظریے اور یورپ کو فتح کرنے کی نیت کے طور متعارف کراتی ہیں۔

ہم علامات پر ہونے والی اس بحث کو اس وقت سمجھ سکیں گے جب ہم اسے حقیقی سوال کی روشنی میں دیکھ پائیں گے۔ حقیقی سوال اسلام کی فطرت پر ہے۔ لیکن اس سوال پر "مذہبی تعصبات" کی دھول جمی ہے۔ کچھ کے نزدیک اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو سیکولرازم، جمہوریت اور کثریت پسندی کی ضد ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اسلام کو یورپ سے مطابقت اور ہم آہنگی اختیار کرنے کے لئے اصلاحات کرنی ہونگی۔ اس صورت میں اسلام کا معتدل بلکہ لبرل ورژن سامنے لانا ہوگا۔

اصلاحات کے اس عمل کے دوران مسلمانوں کو امریکہ کے اصلاح شدہ یہودیوں کی مثال مدِ نظر رکھنی چاہیے۔ مغرب سے ہم آہنگ ہونے کے لئے اصلاح شدہ اسلام انتہاؤں سے پاک، خواتین کی آزادی کا قائل اور جنسی اقلیتوں کو قبول کرنے والا اسلام ہوگا۔ اسلام پر مذہبی نوعیت کی بحث اس لئے بھی لاحاصل ہے کیونکہ مسلمان خود اسلام کی فطرت کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ محض یورپ میں اسلام پر عمل کرنے کی اجازت

مانگ رہے ہیں۔ وہ سوالات پوچھنے پر دباؤ میں آکر مذہبی عمل میں اعتدال کا مظاہرہ تو کرتے ہیں لیکن اسلام کی فطرت پر بحث کرنے سے گریز کرتے ہیں جس (فطرت) کی داغ بیل یا تو یورپ نے ڈالی ہیں یا پھر روایت پسند مسلم معاشروں کے علمائے کرام نے۔ تاہم یورپی مسلمان اس قسم کی مداخلت کو بالکل رد کر دیتے ہیں۔

یورپی ذوق پر پورا اترنے والا اسلام

سعی لاحاصل

یورپ کا سیاسی نظام مذہب اور ریاست کے درمیان علیحدگی کے اصول پر قائم ہے۔ مختلف ریاستوں میں یہ بنیادی اصول مختلف انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈینمارک اور برطانیہ میں سرکاری چرچ وجود رکھتا ہے۔ جرمنی، اٹلی، یونان اور سوئٹزرلینڈ میں تسلیم شدہ چرچ موجود ہے۔ فرانس پرزور انداز میں سیاسی اور نظریاتی سیکولرازم پر قائم ہے۔ مذہب اور ریاست کے درمیان علیحدگی نصاب اور سرکاری مسودوں کے ساتھ ساتھ سیاسی عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریاست کا مذہبی معاملات اور مذہب کا ریاستی معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں۔ ان ممالک میں ریاست کو اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی بھی مذہبی عقیدے کی تشریح یا تعریف مقرر کرسکے۔ تاہم یہ ریاستیں "اچھے اسلام" کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور اچھے مذہبی رہنما پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے مذہبی قائدین جو معتدل ہوں اور یورپ کو آزاد نکتہ نظر سے دیکھیں۔

فرانس کی حکومت نے فرانسیسی مسلم ورشپ کونسل کے قیام کی کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں مساجد کی انتظام کاری اور اماموں کی تربیت کا بندوبست کیا گیا ہے۔ سپین اور اٹلی میں اسلام قبول کرنے والے (نومعتقد) اپنے آپ کو اچھے اور اعتدال پسند مسلمانوں کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ جرمنی میں ایک مسلمان گروپ کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے جو نہایت سیکولر خیالات کا حامل ہے اور سنی مسلمان اس گروپ کو غیر معتقد گروہ کہتے ہیں۔ تاہم یہ گروپ اپنے آپ کو علوی مسلمان کہتا ہے۔

بالفاظِ دیگر، یورپی ذوق پر پورا اترنے والا اسلام پیدا کرنے کی کوششیں یا تو ناکام ہوئی ہیں یا پھر غیر اہم گروہوں کے قیام کا باعث بنی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عوامی سطح پر اسلام کھل کر سامنے آیا ہے اور ریاست کے کنٹرول سے باہر ہو گیا۔ یہ بات کچھ حلقوں کے نزدیک پریشانی کا باعث ہے۔ اگرچہ اسلام مغربی معاشرے کو رد نہیں کرتا لیکن وہ مغربی معاشرے میں اپنی جگہ تلاش کرنے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ مغرب میں اسلام کے نمایاں ہونے کے پیچھے اسلامی تنظیموں کا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ اس کے نمایاں ہونے کی وجہ افراد (باپردہ خواتین) اور مقامی اجتماعات (مساجد) ہیں۔

یورپین مسلمانوں کی رنگارنگی (diversity) اور انفرادیت دو ایسے پہلو ہیں جنہیں یورپین طبقات کو مثبت انداز میں مدِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ان دو خصوصیات کی مدد سے انفرادی اور مقامی بنیادوں پر ہم آہنگی اور جڑت پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن رائے عامہ اس رنگارنگی کے پس منظر میں کسی پوشیدہ جڑت—حتیٰ کہ کسی سیاسی منصوبے—کی تلاش میں ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں دائیں بازو کی جماعتیں میناروں پر پابندی کو ایسا ہی منصوبہ تصور کررہی ہیں جب کہ یہاں مسلمان کی ایک قلیل تعداد مساجد کے ساتھ ساتھ مینار تعمیر کرنے کے حق میں ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں تعمیر کردہ مینار ترک اور البانی اقوام کے ساتھ قومی یکجہتی کے جذبے کے اظہار کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ یہ سب مینار کسی ایسے سیاسی منصوبے کا حصہ نہیں تھے جو اسلام کے نام نہاد عالمگیر نصب العین سے اخذ کیا گیا ہو۔

اسلام کا نمایاں ہونا

ہم آہنگی کا وعدہ

یورپ کے مسلمان کئی وجوہات کی بنا پر مذہبی مباحث میں دل چسپی نہیں رکھتے۔ یورپ یا مسلم دنیا میں چند ایسے مفکرین موجود ہیں جو مصلح کا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ مفکرین مذہبی حلقوں میں قابلِ اعتماد نہیں سمجھے جاتے۔ یورپ کے مسلمان مذہبی مباحث سے زیادہ مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لئے سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ یورپی پس منظر میں اپنے مذہب پر روزمرہ بنیادوں پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک اسلامی علامات کے نمایاں ہونے کا مطلب دشمنی یا ہم آہنگ ہونے سے انکار کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ مسلمان نمایاں ہوکر عوامی حلقوں اور سیاسی نظام میں اپنے مقام کا تقاضا کررہے ہیں۔ سلفی اقلیت کے علاوہ، مسلمانوں کا یورپی ثقافت سے کوئی جھگڑا نہیں۔ مسلمان مسیحی پائرش کے نمونے پر مساجد تعمیر کررہے ہیں۔ یہ مساجد مذہبی مقاصد کی بجائے سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لئے بنائی جاتی ہیں جہاں مسلمان ایک شہر یا ضلع میں اکٹھے ہوپاتے ہیں۔ عام طور پر مسلمان مساجد کی تعمیر میں روایتی تعمیراتی انداز اختیار کرنے کی بجائے جدید عمارات تعمیر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ترکی اور مراکش کی مثالیں مدِ نظر رکھنے کی بجائے آج کے مذہبی امام کے روپ میں جدید طرز کا مذہبی قائد منظرِ عام پر آرہا ہے۔ ہم اس امام کو نہ قاضی کہہ سکتے ہیں نہ عالم۔ یہ نیا امام محض مبلغ اور نماز پڑھانے والا نہیں بلکہ مسجد کا منتظم (منیجر) اور مقامی طبقات کا روحانی ڈائریکٹر ہے۔ عصری امام سماجی کردار ادا کررہا ہے اور اس کا کام مسیحی پادری اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے ساتھ، سیاسی مذہبی اور روحانی روابط کو برقرار رکھنا ہے۔

افواج، مثال کے طور پر فرانسیسی افواج، نے مسلمان عبادت گاہیں قائم کررکھی ہیں جن کے لئے امام کا تقرر ملٹری حکام کرتے ہیں۔ اس سے بھی اسلام کو نمایاں ہونے کا موقع ملتا ہے (افسران اپنے کندھے پر ہلال کا نشان لگاتے ہیں) اور مسیحیت اور یہودی مذہب کی طرح اپنے حلقوں میں مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نمایاں ہونا ہم آہنگی کے لئے ضروری ہے۔ یہاں یہ امر دل چسپی سے خالی نہیں ہے کہ افواج، جو سیاست دانوں کی نسبت قدامت پسند سمجھی جاتی ہیں، اس سیکولر اصول کو سمجھ کر اپنا چکی ہیں لیکن سیاست دان ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کررہے ہیں۔

اسلام پر حقیقی مذہبی مباحثے کے بغیر یورپ سے ہم آہنگ ہونے کو خوش آئند قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہت جلد یورپ کے مسلمان ایسے علما کو جنم دیں گے جو حقیقی مفکرین ہونگے۔ تاہم اسلام کو یورپ سے ہم آہنگ کرنے کے لئے یہ کوئی لازمی شرط نہیں۔

سیاسی دباؤ سے اخلاقی جنگ تک

اگر مندرجہ بالا نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو یورپ میں دکھائی دینے والا اسلام نہ خارجی ہے اور نہ یورپی۔ یہ کسی خاص مذہب کو ماننے والے ہیں جو اپنے آپ کو نئی ثقافتی ضروریات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں مذہب کے مطابق نہیں۔ یہ بات سچ ہے کیونکہ مسلمانوں کی مذہبی حساسیت مسیحی اور یہودی نشاۃ ثانیہ پر یقین رکھنے والوں سے ملتی جلتی ہے۔ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونا اور اسے نمایاں کرنے کی کوشش کرنا صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ یہ یورپی اقدار کا بھی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ آج بھی یورپ آزاد خیال (جن میں سے ہر ایک بائیں بازو کی نمائندگی نہیں کرتا) اور قدامت پسند عناصر (جن میں سے ہر ایک دائیں بازو کی نمائندگی نہیں کرتا) کے درمیان رسہ کشی کا شکار ہے۔

یورپی مذاہب نام نہاد نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں (اناجیلی مسیحیت، آرتھوڈوکس مسیحیت، کیتھولک ازم) یورپی ثقافت کو شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ پوپ نے یورپی کلچر کو "موت کی ثقافت" قرار دیا ہے۔ پوپ کے نزدیک یورپی ثقافت اپنی موت آپ مر رہی ہے۔ اس وقت مسلمان اور مسیحی سیاسی محاذ پر جنگ نہیں لڑ رہے بلکہ اپنی اپنی اقدار اور معیارات کو بچانے کے لئے برسرِپیکار ہیں۔ اس وقت اسقاطِ حمل، ہم جنسوں کی شادیاں (نظریہ ارتقا کے مقابلے میں) تخلیق اور زمین پر انسانی زندگی کے آغاز کے مذہبی نظریات تمام سامی النسل مذاہب کے مشترکہ محاذ ہیں۔ اس طرح یہ مذاہب سیکولرازم سے نہیں بلکہ سیکولرازم کی ظاہری علامات سے جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ مذہبی تحاریک سیاست میں دلچسپی نہیں لے رہیں۔ اقدار کی اس جنگ میں خواہ کوئی سلفی ہو یا قدامت پسند سب ایک ہی صدا بلند کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام، دیگر مذاہب کی طرح، نمایاں ہو رہا ہے۔

مسلمان یورپی معاشروں میں برابری چاہتے ہیں۔ سکارف، حلال کھانے اور مینار، جن پر یورپی سیاست دان لڑ رہے ہیں، دراصل مسلمانوں کے یورپ سے ہم آہنگ ہونے کی علامات ہیں۔ اگرچہ تبدیلی کا یہ عمل اس وقت قدامت پسندانہ مراحل میں ہے اور مسلمان مذہب کے موضوع پر کسی بحث میں دلچسپی نہیں لے رہے۔

دورِ حاضر کا مسئلہ اسلام کو دیگر مذاہب کی طرح یورپی مذہب کے طور پر تسلیم کئے جانے کا ہے۔ مذہبی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اپنی مذہبی وابستگی دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرے گا اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہر شخص کسی انسان کے ایسے مذہب کا احترام کرے گا جو اس شخص نے آزادی سے چنا ہو۔ تاہم شرط یہ ہو گی کہ ہر شخص آئین اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہو۔ اس وقت یورپ مسیحی براعظم نہیں رہا اور

نہ ہی یہ مسلم خطہ بننا پسند کرے گا۔ یہ ایک سیکولر اور جمہوری مقام کے طور پر باقی رہے گا جہاں لوگ مذہبی اور شہری کے طور پر زندگی بسر کر سکیں گے۔

کتاب کی تیاری میں حصہ لینے والوں کے مختصر کوائف

سمیر امغر: سوشیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور سلفی ازم پر مقالہ تحریر کیا۔ وہ فرانس اور شمالی افریقہ میں مسلمان تحریک سازوں پر کئی سٹڈیز تحریر کر چکے ہیں۔ وہ "مغرب میں اسلام پرست: صورتِ حال اور مستقبل کا منظر نامہ"[94] کے مدیر ہیں۔

راچڈ بینزائن: مذہب اور معاشرے کے موضوع پر ایکسن ادارہ برائے سیاسیات میں ماسٹرز پروگرام میں معلم کے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مذہبی مظہر کے مشاہدہ کار ادارے Observatory for Religious Phenomena کے ساتھ محقق کے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ انہیں عصری اسلامی فکر اور جدید قرآنی تشریحات کا ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ حال ہی ان کی نئ کتاب "اسلام کے عصری مفکرین"[95] حال ہی میں شائع ہوئی ہے[96]۔

لارے گیورگس: پیرس کے ادارے[97] سے ڈاکٹریٹ اور مصر میں کاپٹک سوال کے موضوع پر مقالہ تحریر کر چکی ہیں۔ انہوں چینی فلسفے، زبان اور تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ عصری لبنانی فنون پر کئی مضامین اور مصر میں مذہب تبدیل کرنے کے موضوع پر ایک کتاب کی ادارت کر چکی ہیں۔

پیٹرک حائینی: ریلیجسکوپ انسٹی ٹیوٹ میں ہیڈ آف ریسرچ ہیں۔ اس سے پہلے ادارہ برائے معیشت، قانون اور سماجی تحقیق اور مطالعاتی مرکز قاہرہ کے ساتھ منسلک تھے۔ اس کے علاوہ وہ بین الاقوامی کرائسس گروپ میں تجزیہ کار کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ "اسلام منڈی اور قدامت پسند انقلاب"[98] کے موضوع پر ایک کتاب لکھ چکے ہیں[99]۔

سٹیفن لاتھائن: جینوا میں معلم اور گرِس (GRIS) میں چیئر مین کے عہدے پر فائز ہیں۔ گرِس سوئٹزر لینڈ میں اسلام کے موضوع پر کام کرنے والا ایک تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کے علاوہ سٹیفن یورپ کے دیگر تحقیقی اداروں کے ساتھ بھی منسلک ہیں۔ وہ یورپ میں اسلام کی موجودگی جیسے موضوعات پر کئی کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ ان کی آنے والی کتاب کا موضوع "اسلام اور جدیدیت"[100] ہے۔

جین فرانسس میئر: ایک مورخ ہیں جو دورِ حاضر کی مذہبی تحریکوں کے ماہر تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ اس وقت تک کئی زبانوں میں بے شمار مضامین اور کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ ان کی آنے والی کتاب کا نام "انٹرنیٹ اور مذہب"[101] ہے[102]۔ وہ اس وقت فیری برگ میں ریلیجیسکوپ کے قائد

---

94 *Islamismes d'Occident. État des lieux et perspectives*
95 *Les nouveaux penseurs de l'islam*
96 Albin Michel, 2004
97 École des Hautes Études en Sciences Sociales
98 *L'Islam de marché: l'autre révolution conservatrice*
99 Seuil, 2005
100 Islam and Modernity
101 *Internet et religion*

کے فرائض سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنی ویب سائٹ (www.religion.info) کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ان کی ذاتی ویب سائٹ www.mayer.info ہے۔

اولیور موس : ریلیجیسکوپ کے باقاعدہ نمائندے اور عصری اسلامی تاریخ اور اسلام کی عصری تنقید کے موضوعات مقالہ تحریر کرچکے[103] ہیں۔ وہ کافی عرصے تک عرب ممالک میں رہ کر کام کرتے رہے ہیں۔

آلیور روئے : یورپین یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ (فرانس، اٹلی) کے میڈی ٹریننگ پروگرام کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی مشہور کتابیں "گلوبلائزڈ اسلام" اور "مقدس جہالت" ہیں جنھیں کولمبیا یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ انہوں نے فارسی زبان و ادب اور فلسفے میں گریجوایشن اور سیاسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

حصام طمام : صحافی اور محقق جو کہ عرب دنیا اور اسلام پرستی جیسے موضوعات پر دنیا بھر میں ماہر تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ ایک ویب سائٹ (www.islamyoon.net) چلاتے ہیں جو اسلام پرست تحریکوں کا مطالعہ کرتی ہے اور ریلیجیسکوپ انسٹی ٹیوٹ میں وزٹنگ ریسرچر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ قومی پریس اور علمی جرائد میں اسلام پرست تحریکوں پر کئی مضامین تحریر کرچکے ہیں۔

ارون ٹائنر: کانفرنس آف سوئس بشپس اسلامی کمیشن کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ وہ گرس کے بانیوں میں سے ہیں۔ وہ "مسلمان اور سوئس قوانین"[104] کے مصنف ہیں۔ ان کی آنے والی کتاب "مسلم اقلیت اور اس کا مذہب؛ قانونی ڈھانچہ، سوئس کنفیڈریشن کے بنیادی قانونی اور اداراتی مسائل"[105]۔ انہوں نے قانون میں پی ایچ ڈی اور الٰہیات میں فیری برگ یونیورسٹی سے گریجویشن کر رکھی ہے۔

مترجم

ٹام جینز ک: فرانسیسی اور جرمن زبان سے انگریزی زبان میں تراجم کرتے ہیں۔ اس وقت لی ماونڈ ڈپلو میٹس کے انگریزی ایڈیشن کے مترجم کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ٹام بچوں کی کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرچکے ہیں۔

جمشید اقبال: انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی تراجم کرتے ہیں۔ اس وقت تک کئی بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کے لئے مترجم کے فرائض سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں امن، جمہوریت، انسانی حقوق، سیکولرازم اور تنازعات کے حل جیسے موضوعات پر کئی مضامین شائع کرچکے ہیں۔

---

102 Infolio, 2008

103 University of Fribourg/École des Hautes Etudes en Sciences Sociales

104 *Musulmans et l'ordre juridique suisse* (Éditions universitaires, 2002

105 *Die muslimische Minderheit und ihre Religion. Strukturrechtliche und institutionsrechtliche Grundfragen im Bereich des Religionsrechts der Schweizerischen Eidgenossenschaft* (LIT-Verlag, 2008).

سوئٹزرلینڈ میں میناروں پر پابندی
اسلام پر سوال

29 نومبر 2009 میں ووٹنگ کے ذریعے وفاقی آئین میں ترمیم کی گئی جس کے تحت سوئٹزرلینڈ کی سرزمین پر میناروں کی تعمیر پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ووٹنگ کے نتائج نے سیاسی جماعتوں اور ابلاغِ عامہ کے اداروں کو ورطہٴ حیرت میں ڈال دیا۔ میناروں پر پابندی کے اقدام کے حامیوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ وہ اسلامی توسیع پسندی اور اسلام سے منسلک معاشرتی تصورات کے خلاف واضح اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اقدام کا حقیقی مقصد مینار ہرگز نہیں تھے۔ بلکہ مینار ان مسائل کی طرف اشارہ کر رہے تھے جن کی وجہ اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

عصرِ حاضر میں اسلام کا نمایاں ہونا اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک طرف یہ اس بات کی علامت ہے کہ یورپ اور اسلام ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کی موجودگی جارحیت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے کیونکہ اسلام اس نازک توازن کو بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے جو تیز و تند تاریخی واقعات کا ثمر ہے۔ ایسی تاریخ جس میں پہلے پہل مذاہب ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہے اور اس کے بعد ایک سیکولر معاشرے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور جمہوری ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ یورپ میں اسلام کی آمد سے قطع نظر مغرب کے غیر مسلموں کا بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلام، بطور مذہب، مغربی معاشرے سے تال میل یا مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔

اولیور رائے

RELIGIOSCOPE